

# خواتین اور دینی مسائل

(سوالات و جوابات)

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ  
۱۳-۱۱ سی، شاہ عالم مارکٹ، لاہور۔ (پاکستان)

(جملہ حقوق حق ناشر محفوظ ہیں)



نام کتاب: خواتین اور دینی مسائل

مصنف: سید ابوالاعلیٰ مودودی

اشاعت: ایڈیشن

۱ تا ۸۔ مئی ۱۹۸۷ء تا اکتوبر ۱۹۹۸ء

۹۔ مئی ۲۰۰۰ء

۱۱۰۰

اہتمام: پروفیسر محمد امین جاوید (بجٹنگ ڈائریکٹر)

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ ای شاد عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

فون: 7664504-7669546 فیکس: 7658674

ای میل: islamic@ms.net.pk

مطبع: تکبیر پریس، لاہور

قیمت: 57/- روپے

# فہرست مضامین

## عقائد

- ۹ وہابی اور دہلیت  
۱۰ حضرت خواجہ کی پیدائش  
۱۳ ایصالِ ثواب  
۱۶ اصحابِ قبور سے درخواست دعا  
۱۸ بزرگوں کی حرمت و جاہ سے توسل

- ۲۱ مسئلہ حیات النبی  
۲۴ علم غیب - حاضر و غایب غیر اللہ کے لیے مجبہ  
۲۳ خواب میں زیارتِ نبویؐ  
۳۶ سحر کی حقیقت اور معجزات  
۳۸ گھر گھوڑے اور عورت میں نحوست  
۴۱ شفاعت کا صحیح قصور

## عبادات اور فقہی مسائل

- ۲۵ اذان اور نماز کی دعاؤں کے بارے  
میں چند شبہات  
۵۱ اجنبی ماحول میں تبلیغ اسلام  
۵۴ کیا روکنے کی طاقت کے باوجود فدیہ دیا جاسکتا ہے؟  
۶۵ جہاں پر مسیح

## معاشرتی مسائل

- ۶۸ مہر غیر ملوث بل کا حکم  
۷۸ غیر محرم قریبی اعتراف سے پردہ کی صورت  
۷۹ پردہ کے متعلق چند عملی سوالات  
۸۷ رسول کی شریعت  
۹۷ آلات کے فدیے تو اہل دین ناسل  
۱۰۱ اسلام اہل آلات موسیقی  
۱۰۴ عورتوں کا حکم  
۱۰۴ اشتہاری تصویریں  
۱۰۵ کنیز کی تعریف اہل اس کے خلاف ہونے کا حکم  
۱۰۸ تعدد ازواج اور لونڈیاں

- ۱۱۴ تعدد ازواج پر پابندی
- ۱۱۹ توأم متحد البسم و کیوں کا نکاح
- ۱۲۵ طلاق قبل از نکاح
- ۱۲۶ عدت شلخ
- ۱۲۹ ضبط ولادت
- ۱۳۲ ضبط ولادت اور وصیت کے عینین
- ۱۳۵ گناہہ مجرم اور کفارت کا مسئلہ
- ۱۳۶ عالمی قوانین اور قانون شریعت
- ۱۳۷ منکوحہ کتابیہ کے لیے آزادی عمل کی حدود
- ۱۳۸ نکاح چو نہر
- ۱۳۹ اللہ کے حقوق اور والدین کے حقوق
- ۱۴۱ پردہ اور پسند کی شادی
- ۱۴۲ پسند کی شادی میں سکاوٹیں
- ۱۵۱ نکاح کا اصل مقصود
- ۱۵۵ عورت کی خصیت و عفت کا مستقبل
- ۱۵۸ بیوی اور والدین کے حقوق
- ۱۶۰ قرآن میں ذمہ کی سزا
- ۱۶۸ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت و نکاح کے تعلقات

- ۱۷۰ کیا بالغ عورت خود اپنا نکاح کر لینے کی مجاز ہے ؟
- ۱۷۸ شادی بیاہ میں کفارت کا لحاظ
- ۱۸۲ نکاح شغار
- ۱۸۳ منگنی کا شرعی حکم
- ۱۸۵ کیا بڑا قدم پوسے کا مقصد پورا کرتا ہے
- ۱۸۸ عورت اور سفر جرج
- ۱۹۰ وراثت میں اخیانی بہن بھائیوں کا حصہ
- ۱۹۲ محرمات کی حرمت کی دوجہ
- ۱۹۴ عورتوں میں ہم جنسیت
- ۱۹۶ نیک چلتی کا انوکھا قصہ
- ۱۹۹ نیک بھی عیب ہے !

## مستفرق مسائل

- ۲۰۱ بیمہ کا جواز و عدم جواز
- ۲۰۳ اسلامی حکومت میں خواتین کا دارالخروج عمل
- ۲۰۸ بے حیائی کے مظاہر اور قانون اسلام
- ۲۱۳ نقد و تصویر
- ۲۱۵ رشوت اور اضطراب
- ۲۱۷ اسلام اور سناٹا و گمراہی
- ۲۲۲ دعائیں بزرگوں کی حرمت و عامے توکل
- ۲۲۷ نذر و نیاز اور ایصال ثواب
- ۲۲۹ نماز کی قصر و قضاء

## ریاچہ

ماہنامہ ترجمان القرآن میں مختلف مسائل و موضوعات پر لوگوں کے سوالات اور مولانا سید ابوالاعلیٰ کے جوابات رسائل مسائل کے نام سے چار مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جن کے متعدد ایڈیشن اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ان کی علمی افادیت اور عملی رہنمائی کو حسن قبول حاصل ہوا ہے۔ سوالات مختلف تمدنی، سیاسی، معاشی اور فقہی معاملات و امور پر مشتمل ہیں اور مولانا مرحوم نے ان کے ایسے جامع اور مختصر جوابات دیئے ہیں کہ سوال کرنے والوں کی ہی الجھن و دھند نہیں ہو جاتی عام قارئین کو بھی معلومات و رہنمائی کا ایک بیش بہا خزانہ میسر آ جاتا ہے۔

ان سوالات و جوابات میں بے شمار ایسے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں جو خواتین سے متعلق ہیں یا جن کے بارے میں خواتین بھی علم و رہنمائی چاہتی ہیں۔ رسائل و مسائل کی چاروں جلدوں میں ایسے مسائل بھرے ہوئے تھے لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ خواتین کو کچھ اپنی دلچسپی کے تمام مسائل ادا ان کا حل اس طرح مل جائے کہ انہیں رسائل و مسائل کی مختلف جلدوں میں انہیں تلاش نہ کرنا پڑے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہم نے رسائل و مسائل کی چاروں جلدوں سے انتخاب کر کے خواتین کی دلچسپی کے سوالات و جوابات کو الگ مختلف عنوانات کے تحت مرتب کر دیا ہے۔ یہیں توقع ہے کہ اس مجموعہ کو جسے ہم نے ”خواتین اور دینی مسائل“ کا نام دیا ہے، خواتین کے حلقے میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی اس کوشش کو اور زیادہ مفید و مؤثر بنانے کے سلسلے میں مشوروں کا نہ صرف غیر مقدم کیا

جائے گا بلکہ یہ کوشش کی جائے گی کہ آئندہ ایڈیشن این مشوروں کی روشنی میں زیادہ بہتر اور مفید تر بنا کر پیش کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو جاننے اور اس کو اختیار کرنے کی مہمت و توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عبد الوحید خاں  
۵ فروری ۱۹۸۲ء

---



# بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## عقائد

### دہابی اور وہابیت

سوال :- فرقہ وہابیہ کا بانی کون تھا ؟ اس کے مخصوص عقائد کیا تھے ؟  
ہندوستان میں اس کی تعلیمات کس طرح شائع ہوئیں ؟ کیا علما نے اسلام نے  
اس کی تردید نہیں کی ؟ اگر کی ہے تو کس طریقہ پر ؟ آیا اس فرقہ نے اشاعت  
اسلام میں حصہ لیا ہے یا مخالفت اس میں ؟

جواب :- دہابی وہ اصل کسی فرقہ کا نام نہیں ہے۔ محض طرز اور طعن کے طور  
پر ان لوگوں کے لیے ایک نام رکھ دیا گیا ہے جو یا تو اہل حدیث ہیں، یا محمد ابن عبدالوہاب  
کے پیرو ہیں۔ اہل حدیث کا مسلک تو قدیم ہے۔ ائمہ اربعہ کے زمانے سے چلا آتا ہے۔  
اس لیے ان لوگوں کا گروہ ہے جو کسی امام کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے خود حدیث و  
قرآن سے احکام کی تحقیق کرتے ہیں۔ رہے محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو۔ تو وہ دراصل  
حنبل طریقہ کے لوگ ہیں۔ ان کی فقہ اور ان کے عقائد وہی ہیں جو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ  
کے تھے۔ ہندوستان میں یہ مؤخر الذکر گروہ غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں کو  
یہاں دہابی کہا جاتا ہے وہ دراصل پہلے گروہ کے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے اول اول نہایت

اچھا کام کیا اور اب بھی ان میں لپھے افراد پاؤے جاتے ہیں۔ مگر ان میں بہت سے جاہل اور جھگڑالو آدمی بھی شامل ہو گئے ہیں جو خواہ مخواہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر بحث و مناظرہ کا بازار گرم کرتے پھرتے ہیں۔ اس لیے ہی جاہل خود خفی کھلانے والے گروہ میں بھی بکثرت موجود ہیں۔ یہ ساری مناظرہ و مباحثہ اور فرقہ بازی کی گرمی بازار گرمی و فتنوں کی برکت ہے۔

سوال ۱۔ کیا حدیث میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نجد سے ایک فتنہ اٹھے

نکا؟ کیا یہ حدیث مذکورہ بالا فرقہ پر منطبق ہوتی ہے؟

جواب ۱۔ نجد یا شرق کی طرف سے ایک فتنہ اٹھنے کی خبر تو حدیث میں دی گئی ہے مگر اس کو محمد بن عبد الوہاب پر چسپاں کرنا محض گروہ بندی کے اندر سے جوش کا نتیجہ ہے۔ ایک فرقہ جب دوسرے فرقے سے لڑنا چاہتا ہے تو ہر تہیہ اس کے غنا و استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ خدا و رسول کو بھی ایک فرقہ بنانے میں مدد دینے نہیں کرا۔

ترجمان القرآن۔ جب شوال ۱۲۷۷ھ جولائی ۱۹۵۵ء

## حضرت حوا کی پیدائش

سوال ۱۔ حضرت حوا کی پیدائش کے متعلق تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۲۱۹ میں بیان فرمایا کہ

ہے کہ آدم کی پہلی سے نہیں ہوئی۔ حدیث بخاری نے یقیناً آدم کا کیا جواب ہوگا؟

جواب۔ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کی پہلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس خیال کی تائید میں جو چیز پیش کی جاسکتی ہے۔

وہ قرآن کا یہ ارشاد ہے کہ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا

زَوْجَهَا (النساء - ۱) اِنَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (الاعراف - ۲۴) لیکن

ان دونوں آیتوں میں ”مِنْهَا“ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ”اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا“ اور یہ بھی کہ ”اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا“ ان دونوں میں سے کسی معنی کو بھی ترجیح دینے کے لیے کوئی دلیل قرآن کی ان آیتوں میں نہیں ہے بلکہ قرآن کی بعض دوسری آیتیں تو دوسرے معنی کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ فہم میں فرمایا ”وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا رَّأَيْتُمْ“۔ یہی مضمون سورہ نحل آیت ۷۲ میں بھی آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں آیتوں میں ”مِنْ اَنْفُسِكُمْ“ کے معنی ”مِنْ جَنْسِكُمْ“ ہی لیے جائیں گے، نہ یہ کہ تمام انسانوں کی بیویاں ان کی پسلیوں سے پیدا ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلے معنی کو ترجیح دینے کے لیے کوئی بنیاد مل سکتی ہے تو وہ حضرت ابوہریرہؓ کی وہ روایات ہیں جو بخاری و مسلم نے نقل کی ہیں مگر ان کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں کہ :

الرَّأۡةُ كَالضِّلْمِ اِنْ اَقْتَمَّا كَسَدَهَا وَاِنْ اَسْتَمْتَحَتْ  
بِهَا وَفِيهَا عَوَجٌ ۔

عورت ہیل کے مانند ہے اگر تو اسے سیدھا کرے گا تو توڑ دے گا اور اگر اس سے فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اندر کجی باقی رہے ہوئے ہی قائمہ اٹھائے گا ۔

اور دوسری روایت میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل کیے

میں :

اَسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَانَّهُنَّ خَلْقُنَّ مِنْ ضِلْمٍ  
وَاِنْ اَعْوَجَ شَيْءٌ فِي الضِّلْمِ اَعْلَا لَا فَانْ رُحِبْتَ

تقیہ کسرتہ وان ترکیتہ لم یزل اعوج فاستوصوا  
بالنساء خیرا۔

عورتوں کے معاملے میں بھلائی کی نصیحت قبول کر دو کیونکہ وہ پہلے سے پیدا  
ہوئی ہیں۔ اور پہلی کا سب سے بڑا حجتہ اس کا بالائی حصہ ہوتا ہے۔ اگر  
تو اسے بیدھا کرنے کی کوشش کرے تو اس کو توڑ دے گا اور اگر چھوڑ  
دے تو وہ تیرھی ہی رہے گی۔ لہذا عورتوں کے معاملہ میں بھلائی کی  
نصیحت قبول کرو۔

ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی حدیث تو عورت کو پہل سے بعض تشبیہ دے  
رہی ہے۔ اس میں سرے سے یہ ذکر ہی نہیں ہے کہ وہ پہل سے پیدا ہوئی ہے۔ البتہ  
دوسری حدیث میں پہل سے پیدائش کی تصریح ہے۔ لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ اس میں  
حضرت عوا یا پہلی عورت یا ایک عورت کی نہیں بلکہ تمام عورتوں کی پیدائش پہل ہی سے  
بیان کی گئی ہے۔ کیا فی الواقع دنیا کی تمام عورتیں پہلیوں ہی سے پیدا ہوا کرتی ہیں؟

۱۔ یہ الفاظ بھاری کتاب النکاح والی روایت کے ہیں۔ دوسری روایت میں جو نام بخاری  
نے کتاب احادیث الانبیاء میں صحت کے لیے اس کے الفاظ میں : فان السواۃ خلقت  
من ضلع " کیونکہ عورت پہل سے پیدا کی گئی ہے " اس صحت میں السواۃ سے مراد  
ہر عورت، اور عورتوں کی پوری صنف ہوگی ذکر وہ ایک خاص صنف جو دنیا میں سب  
پہلے پیدا کی گئی۔ اس سلسلے میں یہ بات حیرت انگیز ہے کہ سال سنہ  
کے حوالے سے خلقت میں ضلع آدم کے الفاظ نقل کیے ہیں مگر بخاری میں کسی جگہ بھی یہ الفاظ نہیں  
آئے ہیں۔

اگر یہ بات نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو انا پڑھے گا کہ یہاں خُطْبُنِ مِنْ  
 ضَلَم کے الفاظ اس معنی میں نہیں ہیں کہ وہ پہلے سے پیدا کی گئی یا بنائی گئی ہیں، بلکہ اس  
 معنی میں ہیں کہ ان کی ساخت میں پہل کی سی کمی ہے۔ اس کی مثال قرآن مجید کی یہ آیت  
 مَرَّ خَلْقُ الْإِنْسَانِ مِنْ غَنَجٍ۔ اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ انسان جلد بازی سے  
 پیدا کیا گیا ہے، بلکہ یہ ہیں کہ انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہل سے حضرت حواری کی پیدائش کا خیال  
 قرآن ہی میں نہیں حدیث میں بھی کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بنی  
 اسرائیل سے یہ روایت نقل ہو کر مسلمانوں میں شائع ہوئی اور بڑے بڑے لوگوں نے ذمہ  
 اسے قبول کیا بلکہ اپنی کتابوں میں ثبت کر دیا۔ مگر کیا یہ صحیح ہے کہ اللہ اور رسول کی سند  
 کے بغیر محض بڑے لوگوں کے اقوال کی بنا پر اسے ایک اسلامی عقیدہ ٹھہرا دیا جائے اور  
 جو کوئی اس پر ایمان نہ لائے اسے گمراہ قرار دیا جائے؟

## الِیْصَالِ ثَوَاب

سوال ۱۔ مندرجہ ذیل امد میں آپ کی رہنمائی مددگار ہے مجھے امید ہے  
 کہ حسب معمول واضح جواب عنایت فرمادیں گے۔

۱۔ رسائل و سائل حصہ دوم صفحہ ۲۹۹ پر ”تقد و نیاز اور الیصالِ ثواب“ کے  
 عنوان کے تحت جو جواب آپ نے رقم فرمایا ہے اس سے یہ متبادر ہوتا ہے  
 کہ آپ اس امر کے قائل ہیں کہ مالی عبادت سے الیصالِ ثواب ہو سکتا ہے مگر  
 جن عبادت سے نہیں۔ اور پھر آپ مالی انفاق کے بھی متوفی عزیز کے لیے

نافع ہونے کو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف قرار دے رہے ہیں۔ کیا آپ کے استدلال کی یہ وجہ ہے کہ اس امر کی بابت کوئی صراحت قرآنی حدیث میں نہیں ہے کہ بدنی عبارت میں ایصالِ ثواب ممکن ہے ؟ یا کوئی اور سبب ہے ؟

آپ خود ایصالِ ثواب کرنے والے کے لیے تو اتفاق کو بہر حال نافع قرار دے رہے ہیں مگر متوفی عزیز کے لیے نافع ہونے کو اللہ کی مرضی پر موقوف قرار دے رہے ہیں۔ اس تفریق کی اصل وجہ کیا ہے ۔

۲۔ کیا ہر شخص ہر دوسرے متوفی شخص کو (خواہ متوفی اس کا عزیز ہو یا نہ ہو) یا متوفی نے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کی تربیت میں حصہ لیا ہو یا نہ) مالی اتفاق کا ثواب پہنچا سکتا ہے یا کہ اس کے لیے آپ کے نزدیک چند قیود و شرائط ہیں ؟ انہوں کو کم اپنی رائے تحریر فرمادیں ۔

جواب ۱۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات لبر وادب درج ذیل ہیں :-  
(۱) دراصل تو قرآن و حدیث سے عام قاعدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا اپنا عمل ہی اس کے لیے مفید ہے، ایک شخص کا عمل دوسرے کے لیے آخرت میں مفید نہ ہو گا۔ لیکن بعض احادیث سے یہ استثنائی صورت بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایصالِ ثواب بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی کتنی احادیث بھی ہیں لیکن ان سب میں کسی خالص بدنی عبادت کا ذکر ہے جو یا تو صرف مالِ عبادت ہے جیسے صدقہ، یا مالی و بدنی عبادت ملی جلی ہے، جیسے نچ۔ اسی بنا پر فقہاء میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ اسے مالِ اہد بدنی عبادت دونوں میں جاری کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس کو ان عبادت کے لیے

مخصوص کرتا ہے جو یا تو خالص مالی عبادات ہیں یا جن میں بدنی عبادت مالی عبادت کے ساتھ ملی ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا مسلک اس لیے مرجح ہے کہ قاعدہ کلیہ میں اگر کوئی استثناء کسی حکم سے نکلتا ہو تو اس استثناء کو اسی حد تک محدود رکھنا چاہیے جس حد تک وہ حکم سے نکلتا ہے۔ اسے عام کرنا میری رائے میں درست نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے گروہ کے مسلک پر عمل کرتا ہے تو اسے غلامت نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ شریعت میں اس کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اختلاف صرف ترجیح کا ہے۔

دوسری بات کہ ایصالِ ثواب کا میت کے لیے نافع ہونا یا نہ ہونا اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، تو اس کا سبب دراصل یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کی نوعیت محض ایک دعا کی ہے۔ یعنی ہم اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ نیک عمل جو ہم نے تیری رضا کے لیے کیا ہے اس کا ثواب فلاں مرحوم کو دیا جائے۔ اس دعا کی حیثیت ہماری دوسری دعاؤں سے مختلف نہیں ہے۔ اور ہماری سب دعاؤں اللہ کی مرضی پر موقوف ہیں۔ وہ مختار ہے کہ جس دعا کو چاہے قبول فرمائے اللہ جسے چاہے قبول نہ فرمائے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کے لیے ایصالِ ثواب کریں جو اللہ کی نگاہ میں مومن ہی نہ ہو، یا سخت مجرم ہو اور اللہ اُسے کسی ثواب کا مستحق نہ سمجھے۔

ایصالِ ثواب کرنے والے نے اگر واقعی کوئی نیک عمل کیا ہو تو اس کا اجر ہر حال ضائع نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اگر متوفی کو ثواب نہ پہنچائے گا تو نیکی کرنے والے کے حساب میں اس کا اجر ضرور شامل کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی شخص کے نام مٹی آرڈر بھیجیں۔ اگر وہ مٹی آرڈر اس کو نہ دی جائے گی ہو تو لازماً آپ کی رقم آپ کو واپس ملے گی۔

یہ مسئلہ آپ جیل میں کسی قیدی کو کھانا بھیجیں۔ اگر حکومت یہ مناسب نہیں سمجھتی کہ ایک ظالم مجرم کو نفیس کھانے کھلائے جائیں تو وہ آپ کا بھیجا ہوا کھانا پھینک نہیں دے گی، بلکہ آپ کو واپس کر دے گی۔

۲۔ ایصالِ ثواب ہر ایک کے لیے کیا جاسکتا ہے، خواہ متوفیٰ سے کوئی قرابت ہو یا نہ ہو اور خواہ متوفیٰ کا کوئی حقیقہ آدمی کی تربیت میں ہو یا نہ ہو۔ جس طرح دعا ہر ایک کے لیے کی جاسکتی ہے اسی طرح ایصالِ ثواب بھی ہر ایک کے لیے کیا جاسکتا ہے۔  
(ترجمان القرآن - فروری ۱۹۶۱ء)

### اصحابِ قبور سے درخواستِ دعا

سوال :- کسی بزرگ کی قبر پر جا کر اس طرح کہنا کہ ”اے ولی اللہ! آپ ہمارے لیے اللہ سے دعا کریں“ کیا درست ہے؟

جواب :-

کسی بزرگ سے اپنے حق میں دعائے خیر کی درخواست کرنا بجائے خود کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے۔ آدمی خود بھی اللہ سے دعا مانگ سکتا ہے، اور دوسروں سے بھی کہہ سکتا ہے کہ میرے لیے دعا کرو۔ لیکن وفات یافتہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر یہ درخواست پیش کرنا معاملہ کی نوعیت کو بالکل ہی بدل دیتا ہے۔ قبر پر یہ بات کہنے کی رو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اپنے دل میں، یا چپکے چپکے ایسا کہیں، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ ان بزرگوں کی سماعت کی شان دہی کچھ سمجھ رہے ہیں جو اللہ کی ہے کہ :



اَسْوَدًا قَوْلُكَ اَوْ اَجْعَلُهَا رِبًّا د اِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ  
الصُّدُورِ ۔

تم اپنی بات آہستہ سے کہو یا تند سے، وہ تو دلوں کا حال بھی جانتا ہے۔  
دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ زور زور سے اُن ولی اللہ کو پکار کر کہیں۔  
اس صورت میں اعتقاد کی خرابی تو لازم نہ آئے گی مگر یہ اندھیرے میں تیر چلانا ہو گا۔ جو  
سکتا ہے کہ آپ پکار رہے ہوں اور وہ دُشمن رہے ہوں۔ کیونکہ سلام موتی کا مسئلہ  
مختلف فیہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا سلام تو ممکن ہو۔ مگر اُن کی روح وہاں تشریف  
در کھتی ہو، اور آپ خواہ مخواہ خالی مکان پر آوازیں دے رہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا  
ہے کہ اُن کی روح تشریف فرما تو ہو مگر وہ اپنے رب کی طرف مشغول ہوں، اور اپنی  
غرض کے لیے چیخ پیچ کر اُن کو الٹی اذیت دیں۔ دنیا میں کسی نیک آدمی سے دعا  
کرانے کے لیے آپ جاتے ہیں تو مہذب طریقہ سے پہلے ملاقات ہوتی ہے پھر  
آپ عرضِ مدعا کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں کرتے کہ مکان کے باہر کھڑے ہو کر بس چینا  
شروع کر دیا۔ کچھ تپہ نہیں کرا اور میں یا کہ نہیں ہیں۔ میں تو آرام میں ہیں یا کسی کام میں  
مشغول ہیں، یا آپ کی بات سننے کے لیے خالی بیٹھے ہیں۔

اب غور کیجئے کہ وفات یافتہ ضرورگوں کے معاملہ میں جب ہمارے لیے اُن کے  
احوال معلوم کرنے اور اُن سے ہاں شاہد ملاقات کرنے کا موقع نہیں ہے تو اُن کے  
مکانوں پر جا کر اندھا دھند چیخ پکار شروع کر دینا آخر کس معقول آدمی کا کام ہو سکتا ہے  
و غاکر دانے کا یہ طریقہ اگر قرآن و حدیث میں سکھایا گیا ہوتا، یا اس کا کوئی ثبوت موجود  
ہوتا کہ صحابہ کے عہد میں یہ رائج تھا، تب تو بات صاف تھی۔ بڑے اطمینان کے

ساتھ یہ کام کیا جاسکتا تھا لیکن جب وہاں اس کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا تو آخر ایسا طریقہ کیوں اختیار کیا جائے جس کی ایک صورت تو صریحاً صفاتِ الہی کے تصور سے منکراتی ہے، اور دوسری صورت ملائیہ غیر معقول نظر آتی ہے۔

## بزرگوں کی حرمت و جاہ سے توسل

سوال :-

یہ جو دعائیں میں ”بجا و فلاں“ اور ”بحرمت فلاں“ کا اضافہ ملتا ہے اس کی شرعی حیثیت کیلئے؟ سنتِ رسولؐ کیا بتاتی ہے؟ صحابہ کا کیا معمول رہا ہے؟ اور اس طرح (بجاہ — حرمت) دعائے مانگنے سے کوئی دینی قباحت تو لازم نہیں آتی؟

جواب :-

وَعَالِی اللہ تعالیٰ کو کسی کے جاہ و حرمت کا واسطہ دینا وہ طریقہ نہیں ہے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ پاکؐ نے ہم کو سکھایا ہے۔ قرآن تو آپؐ جانتے ہی ہیں کہ اس تخیل سے بالکل خالی ہے۔ حدیث میں بھی اس کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے بھی کسی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ انہوں نے دعائیں یہ طریقہ خود اختیار کیا ہو یا دوسروں کو اس کی تعلیم دی ہو۔ معلوم نہیں کہ مسلمانوں میں یہ تخیل کہاں سے آگیا کہ ربِّ العالمین کے حضور دُعا مانگتے وقت اسے کسی بندہ کی جاہ و حرمت کا حوالہ دیں یا اس سے یہ عرض کریں کہ اپنے فلاں بندے کے طفیل میری حاجت

پوری کر دے، یہ نہیں کہتا کہ ایسا کرنا منوع ہے۔ میں صرف دو باتیں کہتا ہوں۔ ایک یہ کہ ایسا کرنا اُس طریقہ کے مطابق نہیں ہے جو رب العالمین نے خود ہمیں دعا مانگنے کے لیے سکھایا ہے۔ اور اُس طریقہ دعا سے بھی مطابقت نہیں رکھتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے براہ راست شاگردوں کو بتایا تھا۔ اس لیے اس سے اجتناب ہی کرنا چاہیے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتمام انبیاء علیہم السلام آخر نبی بتانے کے لیے تو کئے تھے کہ خدا اور بندوں کے درمیان ربط و تعلق کی صحیح صحت کیا ہے، اور جب انہوں نے اس کی یہ صحت نہ خود اختیار کی، نہ کسی کو سکھائی تو جو شخص بھی اسے اختیار کرے گا وہ معتبر چیز کو چھوڑ کر غیر معتبر چیز اختیار کرے گا۔

دوسری بات میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے تو اس طریقہ دعا میں بڑی کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے معنی سے صرف نظر کر لے۔ اور اس میں کراہیت کا وہ پہلو محسوس نہ کرے جو مجھے نظر آتا ہے۔ میں جب اس طریقہ دعا کے مضمرات پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے کچھ ایسی تصویر آتی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑی سختی داتا ہستی ہے جس کے حدود زے سے ہر کہ وہمہ کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں، جس کا فیض عام ہے، جس کا وہ بار کھلا ہے، جس سے ہر مانگنے والا مانگ سکتا ہے، اور کسی پر اس کی عطا و بخشش بند نہیں ہے۔ ایسی ہستی کے حضور ایک شخص آتا ہے اور اس سے سیدھی طرح یہ نہیں کہتا کہ اے کریم درجیم! میری مدد کر۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ اپنے فلاں دوست کی خاطر میری حاجت پوری کر دے۔ مانگنے کے اس انداز میں یہ بدگمانی پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی صفت رحم و کرم کی وجہ سے کسی کی دستگیری کرنے والا نہیں ہے بلکہ اپنے دوستوں اور چہیتوں اور مقربوں کی خاطر

احسان کر دیا کرتا ہے۔ ان کا واسطہ نہ دیا جائے تو گویا آپ اس کے ہاں سے کچھ پانے کی امید نہیں رکھتے اور بجائے فلاں کہہ کر مانگنے میں تو معاملہ بدگمانی سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ گویا آپ اس پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں فلاں آدمی کا متوسل آیا ہوں، میری درخواست کو کسی بے وسیلہ آدمی کی سی درخواست سمجھ کر نہ ٹال دیجئے گا۔ اگر یہ اس طرز دعا کے مضمرات نہ ہوں تو مجھے سمجھا دیا جائے بڑی خوشی ہوگی کہ میرے دل کی کھشک اس معاملہ میں نکل جائے گی۔ لیکن اس کے واقعی مضمرات یہی ہوں تو میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا صحیح تصور رکھتا ہو وہ ایسا طرز دعا اختیار کرنے کا خیال بھی کیسے کر سکتا ہے۔

اسی طرح کے مضمرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے بھی اس طریق دعا کو کمزور قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں یہ قول موجود ہے۔

ویکرو ان یقول الرجل فی دعائه مجق فلان او  
مجق انبیاءک ورسلك لانه لاحق للمخلوق  
على الخالق۔ (کتاب الکرامیۃ، مسائل متفرقہ)

اردیہ کردہ ہے کہ آدمی اپنی دعائیں مجق فلاں یا مجق انبیاء ورسول کہے کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے۔

(”فاران“: توحید نمبر)

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۱۳۷۷ھ - اکتوبر، نومبر ۱۹۵۷ء)

## مسئلہ حیات النبی

سوال ۱۔

آج کل دینی حلقوں کی فضا میں حیات النبی کا مسئلہ ہر وقت گونجتا رہتا ہے اور علمائے کرام کے نزدیک موضوع سخن بنا ہوا ہے۔ شروع میں تو فریقین اپنی اپنی تائید میں علمی دلائل دے رہے تھے مگر اب تکفیر بازی طعن و تشنیع اور گپڑی اچھالتے تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ الاماشار اللہ بعض مساجد میں باادارہ بنند کہا جا رہا ہے کہ انبیاء اسی طرح زندہ ہیں جس طرح کہ دنیا میں زندہ تھے اور حیات النبی کا منکر کافر ہے۔ بعض دوسرے حضرات حیاتِ جہان کے عقیدے کو مشرکانہ بلکہ فہم شرک قرار دے رہے ہیں۔ جہاں تک فضائل کا تعلق ہوتا ہے وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ بات جو قرآن کریم اور خبر متواتر کے خلاف نہ ہو، مانی جاسکتی ہے۔ لیکن جب بات عقیدہ کی حد تک پہنچ جائے تو وہاں قطعی الثبوت دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ براہِ وکریم میرے دل کی تسلی و تشفی کے لیے مسئلہ حیات النبی پر روشنی ڈالیں۔

جواب ۱۔

مسئلہ حیات النبی کے بارے میں آج کل جس طریق پر علمائے کرام کے مابین بحث چل رہی ہے اس کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کا کچھ حاصل ہی ہے۔ عقیدے کی حد تک ہمارا اس بات پر ایمان کافی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہیں اور

آپ کی ہدایت ابد تک کے لیے کامل ہدایت ہے۔ عمل کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ہم آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں، چے معلوم کرنے کی خاطر قرآن اور سنت ہمارا مرجع و منبع ہے۔ اب آخر اس بحث کی حاجت ہی کیا ہے کہ نبی کریمؐ اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کس معنی میں زندہ ہیں۔ برزخی درو حالی حیات ہو یا جہانی حیات، بہر حال اس امر واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آنحضرتؐ کا لہجہ میں وصال ہو چکا ہے۔ امت کی ہدایت کے لیے آپ نبغس نفیس ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، اور آپ کا اتباع کرنے کے لیے ہیں آپ کی ذات اقدس کی طرف رجوع کرنے کے بجائے قرآن اور حدیث ہی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ حیات برزخی یا حیات جہانی کی بحث کا کوئی بھی فیصلہ ہو، اس سے اس امر واقعہ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

پھر یہ بحث اس لیے بھی ضروری اور لافانی ہے کہ ہم اس خاص معاملے میں کوئی متعین عقیدہ رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکلف ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس مسئلے سے بالکل خالی الذہن ہو یا اس میں کوئی رائے قائم کیے بغیر مر جائے، تو اس کے ایمان میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا، نہ آخرت میں اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے حیات نبی کے برزخی یا جہانی ہونے کے بارے میں کیا عقیدہ رکھا تھا۔ قرآن و حدیث میں کوئی ایسی واضح اور قطعی ہدایت اس باب میں نہیں دی گئی جو ہمیں ایک خاص عقیدہ رکھنے کا پابند کرتی ہو، نہ یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کے درمیان زیر بحث تھا، نہ آنحضورؐ کے جانشینوں نے کسی کو اس معاملے میں کوئی خاص عقیدہ رکھنے کی کبھی تلقین کی۔

میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ حیات النبی کے مسئلے میں حضرات علماء و دینی غلطی کر رہے ہیں جو خلقِ قرآن کے مسئلے میں خلیفہ مامون نے کی تھی۔ یعنی جس چیز کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسلام کا ایک عقیدہ اور ایمانیات کا ایک رکن نہیں قرار دیا تھا اور نہ چسے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کی نجات کا مدار رکھا، اور نہ جس پر اعتقاد رکھنے کی خلق کو دعوت دی تھی، اسے خواہ مخواہ عقیدہ اسلام اور رکن ایمان بنایا جا رہا ہے، اس کے ماننے یا نہ ماننے کو مدارِ نجات قرار دیا جا رہا ہے، اس پر اعتقاد رکھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور اعتقاد نہ رکھنے والوں کی تکفیر و تفسیق کی جا رہی ہے۔ دین میں جن چیزوں کی یہ حیثیت تھی ان کو صفات صاف اور حتمی طوع پر بیان کر دینے میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور علیٰ رؤس الاشہاد ان کی طرف دعوت دی ہے۔ یہ مسئلہ ہرگز ان مسائل میں سے نہیں ہے اور اسے زبردستی ان مسائل میں شامل کرنا یا ان کا سادہ جہ دنیا کلیتہً غلط کاروائی ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسئلے میں قطعاً خالی الذہن ہو یا اس کے بارے میں کوئی عقیدہ درائے نہ رکھتا ہو۔ اس سے قیامت میں کوئی باز پرس نہ ہوگی اور اس کے انجامِ آخر دی پر اس عدم رائے یا خلوتے نہ ہن کا کوئی اثر مترتب نہ ہوگا۔ البتہ خطرے میں وہ شخص ہے جو اس مسئلے میں ایک حقیقہ قائم کرتا ہے اور اس کی تبلیغ کرتا ہے، کیونکہ اس کے عقیدے میں صحت اور عدم صحت دونوں کا احتمال ہے۔

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۵۹ء)

## علم غیب، حاضر و ناظر اور مجبور و غیر اللہ

سوال :-

تفہیم القرآن زیر مطالعہ ہے۔ شرک کے مسئلہ پر ذہن الجھ گیا ہے۔ براہ کرم رہنمائی فرمائیں۔ تفہیم القرآن کے مجبور مطالعہ سے یہ امر ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفات میں عالم النیب ہونا اور وسیع و بصیر ہونا (جس کے تحت ہمارے مرد و عورت و الفاظ حاضر و ناظر بھی آ جاتے ہیں) بھی شامل ہیں۔ خدا کے سوا کسی کو بھی ان صفات سے متصف سمجھنا شرک ہے۔ اور حقوق میں مجبورہ و مکروہ وغیرہ بھی ذات باری سے مختص ہیں۔ شرک کو خداوند نے جرم عظیم اور ناقابل معافی گناہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جرم کا وہ خود کسی کو حکم نہیں دے سکتا۔ مگر فرشتوں کو آدمؑ کے لیے مجبورہ کا حکم دیا۔ اسی طرح کوئی نبی نہ تو شرک کرتا ہے اور نہ کر داتا ہے۔ مگر حضرت یوسفؑ کے سامنے ان کے بھائیوں اور والدین نے مجبور کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مجبورہ غیر اللہ کے لیے شرک ہے تو مندرجہ بالا واقعات کی کیا توجیہ ہوگی ؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ علم غیب اگر خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے تو یہ کسی بھی مخلوق میں نہ ہونی چاہیے۔ لیکن قرآن و حدیث اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ انبیاء و رسل کو علم غیب ہوتا ہے۔ پھر کسی مخلوق میں یا کسی فرد میں اس صفت کو ہم تسلیم کریں تو مزید شرک کیوں ہوتے



ہیں ؟ اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کا علم دیا ہے تو آخر اسے شرک کیوں کہا جائے ؟ جن لوگوں کے خلاف اسی بنا پر شرک کے آکاب کا فتویٰ لگایا جاتا ہے وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ علم غیب کو ذاتی یا نفسی نہیں کہتے بلکہ خدا کا دین قرار دیتے ہیں۔ ان کا اور دوسرے علماء کا اگر اختلاف ہے تو صرف کم یا زیادہ پس ہے جب مسئلہ کم و بیش کا ہی ہے تو پھر فتویٰ شرک کیوں ؟

حاضر و ناظر کی صفت بھی خداوند تعالیٰ سے منحصراً قرار دی جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں اور جنوں کی روحوں کو قبض کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور حاضر و ناظر ہونا خدا کی مخصوص صفت ہے۔ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرض کی انجام دہی کے لیے اپنی خاص صفت فرشتہ میں ودیعت کر رکھی ہے تو جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں صفت حاضر و ناظر ہونا اور خدا کی طرف سے عطا کیا جانا مانتے ہیں آخر انہیں شرک کیوں کہا جاتا ہے ؟

جواب ..

آپ نے شرک کے مسئلے میں اپنی حمد و الجائیں بیان فرمائی ہیں وہ تفہیم القرآن کے مسلسل مطالعہ سے آسانی رفع ہو سکتی ہیں۔ میرے لیے ایک خط

میں ان کو تفصیلاً منع کرنا مشکل ہے۔ تاہم چونکہ ”شُرک“ کا معاملہ بڑا ہی نازک اور خطرناک ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس الجھن میں زیادہ دیر تک مبتلا رہیں اس لیے اختصار کے ساتھ چند الفاظ میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ سجدہ بجائے خود شرک نہیں ہے بلکہ شرک کی علامت ہے۔ اصل میں شرک تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک فی الذات یا فی الصفات یا فی الحقوق ٹھیرانا ہے۔ سجدہ اگر اس طرح کے کسی عقیدے کے ساتھ ہو تو شرک ہے، درہنہ اس فعل سے چونکہ مشرکین کے ساتھ مطلقاً مشابہت ہوتی ہے، اس لیے اسے بجائے خود شرک ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس مشابہت کی بنا پر منسوخ ٹھیرایا گیا ہے۔ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خود حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس لیے فرشتوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ عزوجل کے حکم صریح کی تعمیل میں تھا۔ بطور خود وہ آدم کو قابلِ پرستش یا قابلِ تعظیم سمجھ کر نہیں جھک گئے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں شرک کا کوئی شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

حضرت یوسفؑ کے سامنے والدین اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا وہ اُسے روئے صادق کی بنا پر تھا جو قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ نے خود دکھایا تھا، جسے یوحناؑ یعقوب علیہ السلام نے الہی اشارہ قرار دیا تھا (سورہ یوسف آیات ۲ تا ۶) اور جس کو حضرت یوسفؑ نے بھی آخر کار اسی خواب کا مصداق ٹھیرایا (سورہ یوسف آیت ۱۰۰)۔ اس لیے یہاں بھی جو کچھ ہوا اللہ کے حکم سے ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ جو کام اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا جائے وہ شرک نہیں ہو سکتا۔

اب اُس شخص کے معاملے کو مجھے جو اللہ تعالیٰ کے کسی فرمان کے بغیر کسی بندے کو معظّم و مقدّس سمجھ کر بطور خود اس کے آگے سجدہ بجا لائے۔ کیا کسی دلیل سے اس فعل کو بھی غیر مشرک نہ کہا جاسکتا ہے؟ کیا یہ استدلال صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے پہلے دونوں معاملوں میں سجدہ بغیر اللہ کو جائز رکھا ہے تو یہ فعل مطلقاً جائز ہے؟ یا یہ کہ ہم خدا کے حکم کے بغیر خود جسے چاہیں تعظیماً سجدہ کر سکتے ہیں؟ سورہ کہف میں اللہ تعالیٰ اپنے ایک خاص بندے کے متعلق یہیں بتاتا ہے کہ اُس نے فلاں فلاں مصلح کی بنا پر حکم خداوندی سے کچھ ساکین کی کشتی عیب دار کر دی، اور ایک شرک کو قتل کر دیا۔ کیا اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ہم بھی مصلحت دیکھ کر جس کے مال کو چاہیں نقصان پہنچا دینے اور جسے چاہیں قتل کر دینے کے مجاز ہیں؟ جب اللہ اور اس کے رسولؐ نے نصوص شرعیہ کے ذریعہ سے بغیر اللہ کے لیے سجدے کو حرام کر دیا ہے، اور دوسروں کی جان و مال میں تصرف کے لیے حدود مقرر کر دیئے ہیں، تو کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض خصوصی افعال کو نظر قرار دے کر اور ان پر قیاس کر کے ان منوعات کو اپنے لیے مباح کر لے؟

علم غیب کے مسئلے میں یہ بات سب مانتے ہیں کہ کئی ذواتِ علم غیب اللہ کے لیے مخصوص ہے، اور اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ اپنے علم غیب کا جو حصہ اور جتنا حصہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے دے سکتا ہے۔ یہ جزئی اور عطائی علم غیب اپنی نوعیت میں اُس کئی ذواتِ علم غیب سے مختلف چیز ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے۔ اور کسی بندے کے حق میں اس دوسری نوعیت کے علم غیب کا حقیقہ رکھنا کسی کے نزدیک بھی شرک نہیں ہے۔ دراصل غرابی

جس مقام سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ عقیدت میں غلو کر کے دو ایسی باتیں ایجاد کر لیتے ہیں جو اصل اسلامی عقیدے سے متصادم ہوتی ہیں۔

اول یہ کہ وہ اس عطائیِ عظیم غیب کو جزئی نہیں بلکہ کلی بنا دیتے ہیں اور کسی بندے کے حق میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ اُسی طرح جمیع ممالک و ممالک کا عالم بنا دیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ہے۔ بغاہر یہاں جزئی و کلی کا فرق دور ہو جانے کے باوجود ذاتی اور عطائی کا فرق نظر آتا ہے۔ جس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے۔ لیکن تھوڑا سا بھی آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس طرح کا عقیدہ رکھنے میں کتنا عظیم خطرہ مضمر ہے بالضرر اگر یہ جائز ہو کہ اللہ اپنی عطائے کسی بندے کو اپنے ہی جیسا عالم الغیب و الشہادۃ بنا دے، تو آخر یہ کیوں نہ جائز ہو کہ اُسے اپنی ہی طرح قادرِ مطلق اور حق و قدیم اور خالق و رب بھی بنا دے؟ اس کے بعد خدا کی عطائے کسی بندے کے خدایں جانے میں آخر کیا رکاوٹ باقی رہ جاتی ہے؟ پھر کیا دو مساوی صفات و اختیارات رکھنے والے خداؤں کے درمیان صرف ذاتی اور عطائی کا فرق شرک سے بچانے کے لیے کافی ہوگا؟

دوسری ریاضتی غالی حضرات یہ کرتے ہیں کہ اللہ کے عطیے کو خود باتنے کے مختار بن جاتے ہیں۔ یہ بتانا کہ عطا فرمانے والے نے کسی کو کیا عطا کیا ہے اور کیا نہیں کیا ہے درحقیقت خود عطا فرمانے والے ہی کا کام ہے۔ دوسرے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ معطی کے اپنے بیان کے بغیر وہ بطور خود یہ فیصلہ کرے کہ دینے والے نے کیا کچھ کسی کو عطا فرمایا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب

پاک میں کہیں یہ فرمایا ہو کہ میں نے اپنے فلاں بندے کو جمیع ماکان و مایکون کا عالم بنا دیا ہے، یا اللہ کے رسولؐ نے کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت کی ہو، تو اس کا حوالہ دے دیا جائے، ساری بحث ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر نہ کوئی آیت اس کی تصریح کرتی ہے نہ کوئی حدیث صحیح، تو یہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے اس عطیے کی خبر لوگوں تک آخر کس ذریعہ سے پہنچی ہے؟

اس مسئلے میں یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ عقیدے اور خصوصاً عقیدہ توحید کا معاملہ بڑا ہی نازک ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر کفر و ایمان اور فلاح و خسران کا مدار ہے۔ اس معاملہ میں یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے کہ مختلف احتمالات رکھنے والی آیات اور احادیث میں سے ایک مطلب نچوڑ کر کوئی عقیدہ بنالیا جائے اور اسے داخل ایمانیات کر دیا جائے۔ عقیدہ توصاف اور صریح حکومات سے ماخذ ہونا چاہیے جن میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایک بات ماننے کی دعوت دی ہو، اور یہ ثابت ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی تبلیغ فرماتے تھے، اور صحابہ کرام و تابعین و تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اُس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے یا جمیع ماکان و مایکون کے عالم ہونے کا عقیدہ یہ نوعیت رکھتا ہے؟ اگر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا تو آخر آپ اپنے آپ کو اس خطرے میں کیوں ڈالیں؟

حاضر و ناظر کے معاملے میں آپ نے ملک الموت کی جو مثال پیش کی ہے اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے، اور نہ کسی حدیث میں یہ آیا ہے کہ ساری کائنات کا ملک الموت ایک ہی ہے۔ یہ بات بھی قرآن سے

نہیں معلوم ہوتی کہ صرف ایک فرشتہ قبض روح کا کام کرتا ہے۔ بلکہ متعدد مقامات پر روح قبض کرنے والے فرشتوں کا ذکر بصیغہ جمع ہے مثلاً:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْتُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي النَّفْسِ هُمْ  
قَالُوا فِيهِمْ كُنْتُمْ (النساء: ۹۷)

”جن لوگوں کو طاکر نے اس حال میں وفات دی کہ وہ اپنے نفس پر ظالم کرنے والے تھے اُن سے طاکر نے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے؟“

فَلْيَنْفِ إِذَا تَوَفَّيْتُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ  
وَأَذْبَارَهُمْ (محمد: ۲۷)

”پھر کیا بنے گی اُس وقت جب طاکر ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں کو پٹیتے ہوئے؟“

الَّذِينَ تَوَفَّيْتُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ  
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ (النحل: ۳۲)

”جن لوگوں کی رُوحیں طاکر اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے ان سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر؟“

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا آيُنَا  
مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَا مِنْ دُونِ اللَّهِ (الاعراف: ۳۷)

”یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے ان کے پاس رُوحیں قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے؟“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑے ملک الموت کے تحت بہت سے دوسرے مددگار فرشتے بھی ہیں جو رُوحیں قبض کرنے پر مامور ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ابلیس ایک بڑا شیطان ہے اور اس کی ماتحتی میں بے شمار شیاطین ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ نہ ابلیس جاتا ہے نہ ملک الموت۔

پھر خود اس زمین کی مخلوقات کے بارے میں بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ تمام خنکی و تری اور ہوا کے جانداروں کا ملک الموت وہی ایک ہے جو انسانوں کی جان لینے کے لیے مقرر ہے۔ قرآن میں تو صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ نَسُوفُ ثَاكُفُ مَلَكُ الْمَوْتِ (تمہاری رُوحیں ملک الموت قبض کرتا ہے)۔ اس سے جو بات نکلتی ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اس زمین پر انسانوں کی رُوحیں قبض کرنے پر ایک فرشتہ مامور ہے۔ اگر بالفرض یہی ایک فرشتہ رُوح زمین پر تمام مرنے والوں کی رُوحیں قبض کرتا ہے، تب بھی یہ بہت ہی محدود زمانے کی طاقت ہے جو اللہ نے اپنے اس فرشتے کو عطا فرمائی ہے۔ اس کو آخر اللہ تعالیٰ کی اس لامحدود صفت سے کیا نسبت ہے کہ وہ ساری کائنات میں حاضر و ناظر ہے؟ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اور آپ کیا اب قیاسات پر اپنے عقائد کی عمارت کھڑی کریں گے؟

ملک الموت کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ ہم نے اسے انسانی رُوحیں قبض کرنے پر مامور کیا ہے۔ اس پر زیادہ سے زیادہ جو تصور قائم کیا جاسکتا ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ یہ فرشتہ بیک وقت رُوح زمین کے ہر حصے میں لاکھوں انسانوں کی رُوحیں قبض کر لیتا ہے۔ مگر کیا اس پر یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں اور سب کچھ دیکھ رہے ہیں؟ ان دونوں باتوں میں آخر کیا نسبت

ہے کہ ایک کو دوسری پر قیاس کر لیا جائے؟ اور پھر قیاس بھی ایسا کہ وہ عقیدہ قرار پائے اور ایمانیات میں داخل ہو اور لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے اور نہ مانتے والوں کے ایمان میں نقص ثابت کیا جائے سکے؟ یہ عقیدہ اگر واقعی اسلامی عقائد میں شامل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس کی تصریح فرماتا کہ میرے رسولؐ کو حاضر و ناظر تسلیم کرو۔ حضورؐ خود یہ دعویٰ فرماتے اور اسے ماننے کی دعوت دیتے کہ میں ہر جگہ موجود ہوں اور قیامت تک حاضر و ناظر رہوں گا۔ صحابہ کرام اور سلف صالحین میں یہ عقیدہ عام طور پر شائع و مانع ہوتا اور عقائد اسلام کی کتابوں میں اسے ثبت کیا جاتا۔

آپ نے بعض حضرات کو مشرک کہنے یا نہ کہنے کا جو ذکر فرمایا ہے اس کے بارے میں میری رائے شاید آپ کو معلوم نہیں ہے۔ میں ان مسائل میں ان کے خیالات کو تاویل کی غلطی سمجھتا ہوں، اور اسے غلط کہنے میں تاویل نہیں کرتا۔ مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ انہیں مشرک کہا جائے اور مشرکین عرب سے تشبیہ دی جائے۔ میں ان کے بارے میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ شرک کو شرک جانتے ہوئے اس کے قائل ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ توحید ہی کو اصل دین مانتے ہیں اور اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لیے انہیں مشرک کہنا زیادتی ہے۔ البتہ انہوں نے بعض آیات اور احادیث کی تاویل کرنے میں سخت غلطی کی ہے اور میں یہی امید رکھتا ہوں کہ اگر ضد دلائل والی باتیں نہ کی جائیں بلکہ معقول طریقے سے دلیل کے ساتھ سمجھایا جائے تو وہ جان بوجھ کر کسی گمراہی پر اصرار نہ کریں۔



## خواب میں زیارتِ نبویؐ

مسوال :-

براہ کرم مندرجہ ذیل سوال کے بارے میں اپنی تحقیق تحریر فرما کر تشریف فرمائیں۔  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو قدر  
حقیقت اس نے مجھے ہی دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری مثال میں نہیں آسکتا  
او کما قال ۔

اس حدیث کی صحیح تشریح کیا ہے؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس شکل  
و شباہت میں بھی خواب میں دیکھا جائے تو یہ حضورؐ ہی کو خواب میں دیکھنا  
سمجھا جائے گا؟ کیا حضورؐ کو یوں دیکھنا بھی آپؐ ہی کو دیکھنا  
سمجھا جائے گا؟ اور کیا اس خواب کے زندگی پر کچھ اثرات بھی پڑتے  
ہیں؟

جواب :-

اس حدیث کی صحیح تشریح یہ ہے کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضورؐ  
کی اصل شکل و صورت میں دیکھا اُس نے حقیقت آپؐ ہی کو دیکھا۔ کیونکہ شیطان  
کو یہ قدرت نہیں دی گئی ہے کہ وہ آپؐ کی صورت میں آکر کسی کو بہکا سکے۔ اس  
کی یہی تشریح حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ نے کی ہے۔ امام بخاری کتاب التعلیغ  
میں ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اذا راٰ اذ فی صورتہ رجب کہ دیکھنے والے

نے آپ کو آپ ہی کی صورت میں دیکھا ہو، علامہ ابن حجر سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ابن سیرین سے کہتا کہ میں نے خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے تو وہ اس سے پوچھتے تھے کہ تو نے کس شکل میں دیکھا اگر وہ آپ کی کوئی ایسی شکل بیان کرتا جو آپ کے حلیہ سے نہ ملتی تھی تو ابن سیرین کہہ دیتے تھے کہ تو نے حضور کو نہیں دیکھا ہے۔ یہی طریقہ عمل حضرت ابن عباس کا بھی تھا جیسا کہ حاکم نے بسند نقل کیا ہے۔ بلکہ پھر یہ ہے کہ خود حدیث کے الفاظ بھی اسی معنی کی توثیق کرتے ہیں۔ جن مختلف الفاظ میں یہ حدیث صحیح سندوں سے منقول ہوتی ہے ان سب کا مفہوم یہی ہے کہ شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نہیں آسکتا، نہ یہ کہ شیطان کسی شکل میں اگر آدمی کو یہ دھوکہ نہیں دے سکتا کہ آنحضور کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ اگر کوئی شخص خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے اور آپ سے کوئی امر یا کوئی نہی کا حکم سنے، یا دین کے معاملے میں کسی قسم کا ایما و آپ سے پائے تو اس کے لیے اس خواب کی پیروی اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ اس تعلیم یا ایما کے مطابق کتاب و سنت ہونے کا اطمینان نہ کر لے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمارے لیے دین کا معاملہ خوابوں اور کشفوں اور الہاموں پر نہیں چھوڑا ہے۔ حق اور باطل اور صحیح اور غلط کو ایک روشن کتاب اور ایک مستند سنت میں پیش کر دیا گیا ہے جسے بیداری اور پورے شعور کی حالت میں دیکھ کر راہِ راست معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی خواب یا کشف یا الہام اس کتاب اور اس سنت کے مطابق ہے تو خدا کا شکر ادا کیجے کہ اللہ نے

حضورؐ کی زیارت نصیب کی، یا کشف والہام کی نعمت سے نوازا۔ لیکن اگر وہ اس کے خلاف ہے تو اسے رد کر دیجئے اور اللہ سے معاملہ کیجئے کہ وہ ایسی آزمائشوں سے آپ کو اپنی پناہ میں رکھے۔

ان دو باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بکثرت لوگ گمراہ ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔ متعدد آدمی میرے علم میں ایسے ہیں جو صرف اس بنا پر ایک گمراہ مذہب کے پیرو ہو گئے کہ انہوں نے خواب میں بنی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مذہب کے بانی کی توثیق کرتے یا اس کی طرف التفات فرماتے دیکھا تھا۔ وہ اس گمراہی میں نہ پڑتے اگر اس حقیقت سے واقف ہوتے کہ خواب میں کسی شکل کے انسان کو بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے دیکھ لینا نہ حقیقت حضورؐ کو دیکھنا نہیں ہے اور یہ کہ خواب میں واقعی حضورؐ ہی کی زیارت نصیب ہوتی بھی کوئی حکم شرعی اور امر دینی ایسے خواب سے اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر شیطان کے فریب سے تعقل صرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ آدمی حضورؐ کو آپ کی اصلی شکل میں دیکھے تو اس کا فائدہ صرف انہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا تھا جنہوں نے آپ کو بیداری میں دیکھا تھا۔ بعد کے لوگ آخر کیسے جان سکتے ہیں کہ جو شکل وہ خواب میں دیکھ رہے ہیں وہ حضورؐ ہی کی ہے یا کسی اور کی؟ ان کو اس حدیث سے کیا تسلی ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد کے لوگ اس بات کا اطمینان تو نہیں کر سکتے کہ انہوں نے جو شکل خواب میں دیکھی وہ حضورؐ ہی کی شکل تھی، مگر یہ تو معلوم کر سکتے ہیں کہ خواب کے معنی اور مضمون کی مطابقت قرآن و سنت کی تعلیم سے ہے یا نہیں۔ مطابقت پائی جاتی ہو تو پھر زیادہ

امکان اسی بات کا ہے کہ انہوں نے خواب میں حضورؐ ہی کی زیارت کی ہے، کیونکہ شیطان کسی کو راہِ راست دکھانے کے لیے قہرِ روپ نہیں بھرا کرتا۔

(ترجمان القرآن ذی القعدہ ۱۳۵۵ھ جولائی ۱۹۵۶ء)

## سحر کی حقیقت اور معوذتین کی شانِ نزول

سوال ۱۱

معوذتین کی شانِ نزول کے متعلق بعض مفسرین نے حضور علیہ السلام

پر یہودی لڑکیوں کے جادو کا اثر ہونا اعدانِ سحر قویں کے ہٹنے سے اس کا نازل

ہو جانا بحوالہ احادیث تحریر فرمایا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟ نیز

جادو کی حقیقت کیا ہے؟ بعض اشخاص حضور علیہ السلام پر جادو کے اثر کو

منصبِ نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

جواب ۱۱

شانِ نزول کے بارے میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینے کی ہے کہ مفسرین جب

کسی واقعہ کے متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ آیت اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جب واقعہ پیش آیا اسی وقت وہ آیت نازل ہوئی

تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے اس آیت کا تعلق ہے

معوذتین کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ وہ کتب میں نازل ہوئی ہیں اور احادیث

میں جادو کا جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ درجہِ طیبہ کا ہے۔ اس لیے یہ کہنا براہِ شغل

ہے کہ جب جادو کا وہ واقعہ پیش آیا تو حضورؐ کو ان سورتوں کے پڑھنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

جادو کی حقیقت اگر آپ سمجھنا چاہیں تو قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا قصہ پڑھیں۔ جادو گردوں نے لاشیوں اور رسیوں کے جو سانپ بنائے تھے وہ حقیقت میں سانپ نہیں بن گئے تھے، مگر اُس جمع نے جو وہاں موجود تھا یہی محسوس کیا کہ یہ لاشیاں اور رسیاں سانپوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ حتیٰ کہ خود حضرت موسیٰ کی آنکھیں پیپر ہونے کے باوجود اس قدر مسکھ ہو گئیں کہ انہوں نے بھی انہیں سانپ ہی دیکھا۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ

كُلَّمَا نَفَّسُوا سَخَرُوا أَغْيَيْنَ النَّاسِ وَاسْتَرْجَبُوهُمْ

(اعراف ۱۲۰)

جب جادو گردوں نے اپنے ان پھر پھیلے تو لوگوں کی آنکھوں کو مسکھ کر دیا اور انہیں مرعوب کر دیا۔

فَإِذَا جَاءَهُمْ وَعِصِيَّتُهُمْ بِخِيَلٍ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ  
أَنَّهُمْ لَأَنبَىٰ ۚ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً  
مُوسَىٰ ۚ (طہ - ۳)

پس یکایک ان کے جادو کی وجہ سے ان کی لاشیاں اور رسیاں موسیٰ کو دھڑکتی ہوئی محسوس ہوئیں اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جادو قلبِ مہریت نہیں کرتا بلکہ ایک خاص قسم کا نفسیاتی اثر ڈال کر آدمی کے حواس کو متاثر کر دیتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ

جادو کی یہ تاثیر عام انسانوں پر ہی نہیں، انبیاء پر بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس ذریعہ سے کوئی جادوگر کسی نبی کو شکست نہیں دے سکتا، نہ اُس کے مشن کو فیل کر سکتا ہے، نہ اُسے اس حد تک متاثر کر سکتا ہے کہ وہ جادو کے زیرِ اثر آکر منصبِ نبوت کے خلاف کوئی کام کر جائے، لیکن بجائے خود یہ بات کہ ایک نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے، خود قرآن سے ثابت ہے۔

احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کی جو روایات آئی ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی عقل، تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہیں ہے، اور نہ قرآن کی بنا پر اس حقیقت کے خلاف ہے جس کی میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ بنی اگر زخمی یا شہید ہو سکتا ہے تو اُس کا جادو سے متاثر ہو جانا کونسی تعجب کی بات ہے؟ روایات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ چند مذہب تک حضور کو کچھ لسیانِ سلاحتی ہو گیا تھا اور وہ بھی تمام معاملات میں نہیں بلکہ بعض معاملات میں بزدلی طور پر۔

(ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۱۳۷۰ھ۔ جون، جولائی ۱۹۵۲ء)

## گھر، گھوڑے اور عورت میں نحوست

سوال ۱۔

میں رہائش کے لیے ایک مکان خریدنا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا مکان فروخت ہو رہا ہے، جس کا، لگ بھگ بالکل لاوارث فوت ہوا ہے اور دوسرے رشتہ

داروں کو وہ مکان میراث میں ملا ہے۔ میں نے اس مکان کے خریدنے کا ارادہ کیا تو میرے گھر کے بعض اخوان مزاحم ہوئے اور کہنے لگے کہ گھر منحوس ہے، اس میں رہنے والوں کی نسل نہیں بڑھی حتیٰ کہ اصل مالک پر خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ گھر کے لوگوں نے ان احادیث کا بھی حوالہ دیا۔ جن میں بعض گھروں، گھوڑوں اور عورتوں کے منحوس ہونے کا ذکر ہے۔ میں نے کتب احادیث میں اس سے متعلق روایتیں دیکھیں اور متعارف شروح و حواشی میں اس پر جو لکھا گیا ہے وہ بھی پڑھا، لیکن جزم و یقین کے ساتھ کوئی متعین توجیہ سمجھ میں نہ آ سکی۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب :-

جن روایات کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ کتب حدیث میں وارد تو ہوئی ہیں۔ مگر حضرت عائشہ کی روایت سے ان کی حقیقت کچھ اور معلوم ہوتی ہے اہم احمد نے اپنی مسند میں اس کو یوں نقل کیا ہے :

عن ابی حسان الاعرج ان رجلین دخلا علی عائشة وقالتا ان اباهما یرویة یحدث ان النبی سلی اللہ علیہ وسلم کان یقول انما الطیورۃ فی المرأة والدابة والدار۔ فقالت والذی انزل القرآن علی ابی القاسم ما ہکذا کان یقول ولكن کان یقول کان اهل الباہلیۃ یقول الطیورۃ فی المرأة والدابة والدار، ثم قرأت عائشة ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا۔

ابو حسان ارج سے روایت ہے کہ وہ آدمی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ بنی ملیک علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ”بدشگونئی تو حرف عورت اور گھوڑے گھر میں ہے“ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس نے قرآن ابوالقاسم (یعنی آنحضرت معلوم) پر نازل کیا ہے، آپؐ یوں نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ آپؐ یہ کہا کرتے تھے کہ اہل جاہلیت، عورت، گھوڑے اور گھر میں نحوست و بدشگونئی کے قائل تھے۔ پھر حضرت عائشہؓ نے یہ آیت پڑھی: کوئی مصیبت زمین میں اور تمہارے نفوس میں نہیں آتی مگر اس کے روزنا ہونے پہلے وہ ایک نوشتے میں لکھی ہوتی ہے۔

ام المؤمنین کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جو روایت بیان کی ہے وہ غالباً صحیح الفاظ میں نقل نہیں ہوئی ہے۔ تاہم اگر اس کو درست مان بھی لیا جائے تو اس کی ایک معقول توجیہ بھی ہو سکتی ہے۔

نحوست کا ایک مفہوم تو دھرم پرستانہ ہے جسے اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ہے لیکن نحوست کا ایک دوسرا علمی مفہوم بھی ہے۔ اس سے مراد کسی چیز کا ناموافق اور ناسازگار ہونا ہے۔ یہ مفہوم معقول بھی ہے اور شرعیت میں معتبر بھی۔ چنانچہ حدیث میں مکان کے منحوس ہونے کا جہاں ذکر ہے وہاں مطلب یہ نہیں ہے کہ مکان میں کوئی ایسی دہمی چیز موجود ہے جو رہنے والوں کی قسمت بگاڑ دیتی ہے بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ تجربے اور مشاہدے سے اس مکان کے لیے ناموافق ثبوت کر دیا ہے۔ بسا اوقات کسی مرض کے متعدد مریض ایک مکان میں یکے بعد دیگرے



ہتے چلے آتے ہیں یہاں تک کہ مرض کے زہریلے اثرات وہاں مستقل طور پر جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اب اگر تجربے سے یہ معلوم ہو جائے کہ جو وہاں رہا وہ اس مرض خاص میں مبتلا ہو گیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ مکان اب سکونت کے لیے ناموافق ہو گیا ہے خصوصیت کے ساتھ طاعون اور دق کے معلقے میں یہ بات بارہا تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔ احادیث میں بھی یہ حکم موجود ہے کہ جہاں طاعون پھیلا ہوا ہو وہاں سے بھاگو بھی نہیں اور قہراً وہاں جاؤ بھی نہیں۔ ایسا ہی معاملہ عورت اور گھوڑے کا لگنے اگر متعدد آدمیوں کو ایک گھوڑے کی سواری ناموافق آئی ہو، یا متعدد آدمی ایک عورت سے نیچے بعد دیگیئے نکاح کر کے خاص مرض کے شکار ہوئے ہوں تو یہی سمجھا جائے گا کہ اس گھوڑے یا اس عورت میں کوئی نامعلوم خرابی ہے۔

اب یہ دیکھنا آپ کا کام ہے کہ جس مکان کو آپ خریدنا چاہتے ہیں اس کی نحوست دہمی نوعیت کی ہے یا تجربی نوعیت کی۔

(ترجمان القرآن - ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ - جنوری ۱۹۵۳ء)

## شفاعت کا صحیح تصور

سوال :

کسی مولوی صاحب نے ایک اشتہار شائع کیا ہے جس میں آپ پر مغزلی اور خارجی ہونے کا فتویٰ لگایا ہے۔ بنائے فتویٰ یہ ہے کہ آپ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قیامت کے روز امت کے بارے میں شفاعت کے

منکر ہیں۔ اس کا حوالہ ترجمان القرآن جلد ۲۶ عدد ۲۰ ص ۲۰ سے لیتے ہوئے  
آیت ”جنگ کرو اہل کتاب میں ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت  
پر ایمان نہیں لاتے“ کے تشریحی نوٹ کا دیا ہے۔ یہ نوٹ یوں ہے :  
”وہاں کوئی سعی سفارش، کوئی فدیہ اور کسی بزرگ سے منسوب ہونا کام نہ  
آئے گا“ اسی طرح تفہیمات سے بھی کوئی حوالہ اسی قسم کا اخذ کیا ہے۔

براہِ کرم آپ بیان فرمائیں کہ اہل سنت کا عقیدہ شفاعت کے بارے  
میں کیا ہے۔ بنی مسلم اپنی امت کی شفاعت کس حیثیت سے کریں گے نیز  
کیا وہ ساری امت کی طرف سے شفع ہوں گے ؟  
جواب :-

خدا ان لوگوں کو نیک ہدایت دے جو دوسروں کی طرف غلط باتیں منسوب  
کر کے دنیا میں پھیلاتے ہیں اور ان کے اقوال کو ایسے معنی پہناتے ہیں جو قابل  
کے فساد کے خلاف ہوں۔ اگر الزام لگانے والے بزرگ کے دل میں خدا کا کچھ  
خوف ہوتا تو وہ اشتہار کی اشاعت سے پہلے مجھ سے کچھ کر پوچھ سکتے تھے کہ تیری  
ان عبارت کا فساد کیا ہے، اور شفاعت کے بارے میں تیرا عقیدہ کیا ہے۔ میری  
جن عبارتوں کا انہوں نے حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک یہود و نصاریٰ کے غلط  
عقیدہ شفاعت کی تردید میں ہے۔ اور اس کا اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس غلط  
عقیدے کی وجہ سے کس طرح اہل کتاب کا ایمان بالیوم الآخر باطل ہو گیا ہے جس  
کی بنا پر قرآن میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔  
دوسری عبارت میں ان تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے جو بنی صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنی دعوت رسالت کے آغاز میں مشرکین مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمائی تھیں  
 دونوں میں سے کسی مقام پر بھی اسلام کے عقیدہ شفاعت کو بیان کرنے کا موقع  
 نہ تھا۔ آخر کافروں اور مشرکوں کے سلسلے میں اُس شفاعت کا ذکر کیوں کیا جاتا جس  
 کے متحق صرف اہل ایمان ہیں؟ کافروں اور مشرکوں کے معاملے میں جو کچھ میں نے لکھا  
 ہے وہ وہی کچھ ہے جو قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

اَتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ  
 مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ۔

رہا اسلامی عقیدہ شفاعت تو وہ قرآن و حدیث کی رو سے یہ ہے کہ قیامت  
 کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت صرف اہل ایمان کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت  
 سے، اور صرف اُسی شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت ہے۔  
 ملاحظہ ہو۔

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ اِذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ  
 وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا۔

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِاِذْنِهِ۔

اس قاعدے کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں یقیناً شفاعت فرمائیں گے، مگر  
 یہ شفاعت اللہ کے اذن سے ہوگی اور اہل ایمان کے حق میں ہوگی جو اپنی حد  
 وسیع کے نیک عمل کرنے کی کوشش کے باوجود گناہوں میں آلودہ ہو گئے ہوں۔  
 جان بوجھ کر خیانتیں اور بدکاریاں کرنے والے، اور کبھی خدا سے نہ ڈرنے والے  
 لوگ حضور کی شفاعت کے متحق نہیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضور کا ایک طویل

خطبہ مروی ہے جس میں آپ ہرم خیانت کی شدت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں  
 کہ قیامت کے روز یہ خائن لوگ اس حالت میں تائیں گے کہ ان کی گردن پر ان  
 کا خیانت سے حاصل کیا ہوا مال لٹا ہوگا اور وہ مجھے پکاریں گے کہ یا رسول اللہ  
 انجسبی ! (یا رسول اللہ! میری مدد فرمائیے)، مگر میں جواب دوں گا کہ لا املك  
 لك شيئا، قد اهلقتك (میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا، میں نے تجھ تک  
 خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا)۔ علامہ جو :- مشکوٰۃ باب قسمۃ الغنائم، القول فیہا  
 (ترجمان القرآن، محرم ۱۳۷۰ھ - نومبر ۱۹۵۰ء)

# عبادات اور فقہی مسائل

## اذان اور نماز کی دعاؤں کے متعلق چند شبہات

سوال ۱:-

ایک دن میں صبح کی اذان سن رہا تھا کہ ذہن میں عجیب و غریب سوالات ابھرنے لگے اور شکوک و شبہات کا ایک طوفان دل میں برپا ہو گیا۔ — اذان سے ذہن نماز کی طرف منتقل ہوا اور جب سوچنا شروع کیا تو نماز کی عجیب صورت سامنے آئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز کس طرح پڑھوں اور کیا پڑھوں ؟ .....

ایک مسلمان کو ماں کی گود ہی میں جو اذیں حدس جتنا ہے وہ یہ ہے۔  
 ”اللہ ہی عبادت کے لائق ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں“ — پھر  
 (۱) اذان بلا واسطہ خالصتہ اللہ کی عبادت کے لیے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں، تو اشهد ان لا الہ الا اللہ کے ساتھ ہی  
 اشهد ان محمد رسول اللہ کے کیا معنی ؟

(۲) نمازیں سورۃ فاتحہ، اخلاص یا کوئی اور کوئی اور سورہ جو ہم پڑھتے ہیں ان میں صرت اللہ ہی کی حمد ثنا اور ثلثت و ہدایت کا بیان ہے۔ اسی طرح رکوع و کھڑ میں اُسی کی تسبیح و تہلیل بیان ہوتی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہم تشہد کے لیے بیٹھتے ہیں تو حضور سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ تشہد امددوں مدد و شریف وغیرہ۔ کیا اس طرح حضور کی عبادت میں شریک نہیں ہو جاتے؟

(۳) دونوں مدد و شریف جو ہم پڑھتے ہیں ظاہر ہے کہ حضور اس طرح نہیں پڑھتے ہوں گے۔ کیونکہ ہم تو پڑھتے ہیں اللھم صل علی محمد و علی آل محمد رے اللہ رحمت فرما محمد پر اور محمد کی آل پر، یہ دونوں مدد و شریف درحقیقت دعائیں ہیں اور اسی طرح اور دعا ربّ اجعلنی بھی۔ عبادت نام دعاؤں کا نہیں بلکہ اُس خالق ارض و سما کی حمد و ثنا بیان کرنے کا نام ہے تو کیا یہ زیادہ مناسب نہیں کہ عبادت کے اختتام پر دعائیں مانگی جائیں، بہ نسبت اس کے کہ عین عبادت میں دعائیں مانگی شروع کر دی جائیں؟ میرا خیال ہے کہ حضور خود تشہد اور مدد و شریف

وغیرہ نہیں پڑھتے ہوں گے کیونکہ آپ سے یہ بعید ہے کہ عین نماز میں آپ اپنے لیے مانگنے لگتے۔ پھر ذرا تشہد پر غور فرمائیے۔ ظاہر ہے کہ مدد کی طرح اگر حضور تشہد بھی پڑھتے تھے تو وہ بھی الگ ہو گا۔ کیونکہ ”اے نبی! تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں“ کی جگہ آپ پڑھتے ہوں گے ”مجھ پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی

برکتیں نازل ہوں۔“

(۴) اللہ کی جو عبادت ہم بجالاتے ہیں اس کا نام الصلوٰۃ یعنی نماز ہے پھر یہ فرض، سنت، وتر نفل کیا چیزیں ہیں اللہ یہ پڑھ کر ہم کس کی عبادت کرتے ہیں۔ جاتے تو ہم میں اللہ کی عبادت بجالانے اللہ پڑھنے لگتے ہیں نماز سنت۔ جس کی نیت بھی یوں باندھتے ہیں، دو رکعت نماز سنت سنت رسول اللہ کی وغیرہ وغیرہ۔ کیا اس طرح بھی حضور کا اللہ کی عبادت میں شریک ہو جانا ثابت نہیں ہوتا؟

(۵) نماز کے آخر میں جو سلام ہم پھیرتے ہیں اس کا مخاطب کون

ہے؟

(۶) کیا حضور بھی روزانہ پانچ نمازیں بجالاتے تھے؟ اور اتنی ہی رکعتیں پڑھتے ہیں؟ اس سوال کی قدر سے میں نے تحقیق کی لیکن کوئی مستند حوالہ فی الحال ایسا نہیں ملو کہ اس سوال کا جواب ہوتا۔ بخلاف اس کے بخاری شریف میں حدیث نظر آئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کی دو دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی طرح مؤطا کتاب الصلوٰۃ میں یہ لکھا دیکھا کہ رات دن کی نماز دو دو رکعت ہے۔ یہ دونوں حدیثیں دو دو رکعت نماز ثابت کرتی ہیں۔

ان خیالات و شکوک نے ذہن کو پر اگندہ کر رکھا ہے اور اکثر

مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ باری موجودہ نماز وہ نہیں ہے جو آنحضرتؐ نے بتائی ہوگی۔ خدا را میری انجمن کو دور فرمائیے اور مجھے

گمراہ ہونے سے بچائیے۔ مجھے نماز چھوٹ جانے کا خطرہ ہے۔  
جواب :-

آپ کے دل میں اگر وسوسہ پیدا ہوا کریں تو ان کی وجہ سے نماز ترک نہ کرو یا کریں۔ بلکہ نماز پڑھتے رہیں اور اپنے وسوسوں کے متعلق کسی جاننے والے سے پوچھ کر اپنا اطمینان کر لیا کریں۔

جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کے جوابات یہ ہیں :

(۱) اذان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی شہادت دی جاتی ہے نہ کہ خدا ہونے کی۔ پھر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا کہ رسالت کی شہادت دینے سے عبادت میں شرک واقع ہو جائے گا ؟ رسالت کی شہادت تو اس لیے دی جاتی ہے کہ ہم خدا کی عبادت اُس عقیدے اور طریقے کے مطابق کر رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سکھایا ہے۔ ہم نے خود اپنی فکر سے یہ طریقہ اور عقیدہ ایجاد نہیں کر لیا ہے۔

(۲) تشہد کی پوری عبارت پر آپ غور کریں۔ پہلے آپ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا سلام پیش کرتے ہیں۔ پھر رسول ﷺ کے لیے رحمت و برکت کی دعا کرتے ہیں۔ پھر اپنے حق میں اور تمام نیک بندوں کے حق میں سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ پھر اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتے ہیں جو دراصل اللہ تعالیٰ ہی سے اس امر کی دعا ہے کہ وہ حضور پر اپنی نوازشات کی بارش فرمائے۔ پھر اللہ سے اپنے حق میں اور اپنے والدین کے حق میں بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ ان سارے مضامین کو آپ خود دیکھیں۔ ان میں کیا چیز ہے



جسے آپ شرک کہہ سکتے ہیں؟ یہ تو ساری دعائیں اللہ تعالیٰ ہی سے ہیں۔ کیا اللہ سے دعا کرنا شرک ہے؟ اور کیا اللہ کے رسول کو رسول ماننا بھی شرک ہے؟

(۲) یہ غلط فہمی آپ کو کہیں سے ہو گئی کہ عبادت صرف اللہ کی حمد و ثنا

کرنے کا نام ہے اور اللہ سے دعا کرنا عبادت نہیں ہے۔ دعا تو روح عبادت

ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ان مشرکین کو جو غیر اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں، غیر اللہ کی

عبادت کرنے والا قرار دیا ہے، حتیٰ کہ اکثر مقامات پر 'يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ

اللّٰهِ' کہنے کے بجائے 'يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں

اور حکم دیا گیا ہے کہ اللہ ہی سے دعا مانگو۔

یہ تشہد جو ہم پڑھتے ہیں، یہ حضورؐ نے صحابہ کو سکھایا تھا اور انہیں ہدایت فرمائی

تھی کہ تم یہ پڑھا کرو، اس لیے ہم کو نمازیں یہی پڑھنا چاہیے۔ رہا حضورؐ کا اپنا

تشہد، تو اس کے متعلق احادیث میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ حضورؐ خود کیا پڑھتے

تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کے تشہد میں الفاظ مختلف ہوتے ہوں۔ اور یہ بھی

بعید از قیاس نہیں کہ حضورؐ خود بھی یہی تشہد پڑھتے ہوں۔ اگر ہم نمازیں اپنے

لیے دعا کرتے ہیں تو آخر آپؐ کو اس پر کیا اعتراض ہے کہ حضورؐ بھی نمازیں اپنے

لیے دعا فرماتے ہوں؟ اسی طرح اگر ہم حضورؐ کے نبی ہونے کی شہادت نماز میں

دیتے ہیں تو اس میں آخر کیا خرابی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی نبوت کی شہادت

دیتے ہوں؟

(۳) فرض نماز کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو اس کے عائد کردہ

فریضہ صلوٰۃ کو ادا کرنے کے لیے کم سے کم لازم ہے۔ جس کے بغیر حکم کی تکمیل

سے ہم قاصر رہ جائیں گے۔ سنت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو فرض کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ادا کیا کرتے تھے اور جس کی آپ نے ہمیں تاکید کی ہے۔ نفل سے مراد ہے خدا کی وہ عبادت جو ہم اپنی خوشی سے کرتے جسے ہم پر نہ لازم کیا گیا ہے اور نہ جس کی تاکید کی گئی ہے۔ اب فرمائیے کہ اس میں شرک کہاں سے آیا؟ ”سنت رسول اللہ کی“ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ رسول اللہ کی نماز پڑھی جا رہی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض سے زائد پڑھا کرتے تھے اور آپ کے اتباع میں ہم بھی پڑھتے ہیں۔

(۵) کسی عمل کو ختم کرنے کے لیے آخر اس کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ نماز ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ جو قبلہ مدینہ کی عبادت کر رہے تھے، اب دونوں طرف منہ پھیر کر اس عمل کو ختم کر دیں۔ اب منہ پھرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ پچکے سے منہ پھیریں اور دوسری صورت یہ ہے کہ آپ خدا سے تمام خلق کے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہوئے منہ پھیریں۔ آپ کو ان میں سے کون سی صورت پسند ہے؟

(۶) جن احادیث کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ ابتدائی دور کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل جب کہ نماز کے احکام بتدریج مکمل ہو چکے تھے یہی تھا کہ آپ پانچوں وقت وہی رکعتیں پڑھتے تھے جو اب تمام مسلمانوں میں رائج ہیں۔ یہ چیز دوسری متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ حضرت عمرؓ کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے وہ نوافل سے متعلق ہے۔

(ترجمان القرآن - فروری ۱۹۶۱ء)

## اجنبی ماحول میں تبلیغ اسلام

سوال :-

میں علی گڑھ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہوں اور آج کل ناٹھیریا میں بحیثیت سائنس ٹیچر کام کر رہا ہوں۔ جب میں ہندوستان سے یہاں آ رہا تھا اس وقت خیال تھا کہ میں ایک مسلم اکثریت کے علاقہ میں جا رہا ہوں اس لیے شرعی احکام کی پابندی میں کوئی وقت نہیں ہوگی۔ لیکن یہاں آکر دیکھا تو معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ جس علاقے میں میرا قیام ہے یہ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہاں عیسائی مشنریز خوب کام کر رہے ہیں۔ بہت سے اسکول اور ہسپتال ان کے ذریعے سے چل رہے ہیں۔ مسلمان یہاں پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ بھی تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ اگر یہ نہیں بول سکتے حالانکہ ہر ایک عیسائی 'تھوڑی بہت' انگریزی بول سکتا ہے پڑھے لکھے لوگوں کی بہت انگ ہے۔ یہاں پر بہت سے غیر ملکی ٹیچر اور سوداگر کام کر رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر عیسائی اور ہندو ہیں۔ میں اپنی طرز کا اکیلا ہوں۔ میرے شہر میں تین بہت چھوٹی مسجدیں ہیں۔ وہ بہت ہی شکستہ حالت میں ہیں۔ اس کے علاوہ دُور دُور کہیں اذان کی آواز بھی نہیں آتی۔ یہ ملک اکتوبر میں آزاد ہونے والا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلم کلچر کے متغایر میں مغربی اور عیسائی کلچر بہت نمایاں ہے۔ شراب کا استعمال شاید مغربی ممالک سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن ان سب کے

باوجود وہ باتیں یہاں خاص طور پر دیکھنے میں آئیں۔ ایک انسانی رواداری اس معاملے میں یہ لوگ ہم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ غیر ملکی خیر مقدم کرتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جو مسلمان یہاں ہیں ان کے اوپر مغربی طرز فکر کا اتنا اثر نہیں ہوا جتنا کہ ہمارے ہاں ہے۔ لیکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ لوگ اب تک مغربی تعلیم کا بائیکاٹ کرتے رہے ہیں۔

ان حالات میں آپ مشورہ دیجئے کہ کس طرح اسلام کی صحیح فائدگی کی جائے اور یہاں کے لوگوں کو انگریزی میں کونسا لٹریچر دیا جائے۔ پڑھا کھا طبقہ انگریزی لٹریچر سمجھ سکتا ہے۔ ”پودہ“ کی طرح اگر کوئی کتاب شراب نوشی پر اسلامی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی ہو تو اس سے بھی مطلع فرمائیے!

دوسرے یہ بھی آپ سے مشورہ چاہتا ہوں کہ ایسے حالات میں کس طرح انسان صحیح راہ پر قائم رہے جبکہ ماحول اور سماجی دوسرے رنگ میں رنگے ہوں۔

فہمی حسب ذیل چیزوں پر اگر روشنی ڈالیں تو آپ کا شکور ہوں گا۔  
۱۔ یہاں پر دعوتوں اور پارٹیوں میں شراب کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے ایسی صورت میں ان دعوتوں میں شرکت کرنا چاہیئے یا نہیں؟ اب تک میرا طرز عمل یہ رہا ہے کہ ایسی جگہوں پر صرف شرکت کرتا ہوں اور شراب اور دوسری اس قسم کی چیزوں سے انکار کر دیتا ہوں تاکہ کم از کم ان کو یہ احساس ہو جائے کہ بعض لوگوں کو ہماری یہ مرغوب غذا ناپسند ہے۔

۲۔ ان کے برتنوں میں کھانا اور پیانا درست ہے یا نہیں؟

۳۔ بہت سی چیزیں ہیں جن میں الگول کی تھوڑی بہت آمیزش ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔ ان کا استعمال جائز ہو سکتا ہے یا نہیں ؟

۴۔ اگر کوئی دعوت کچھ لوگوں کو یہاں دی جائے تو اس میں شراب دی جا سکتی ہے یا نہیں جو کیونکہ یہاں کے لوگ بغیر شراب کے دعوت ہی نہیں سمجھتے اور اگر اس کا استعمال نہ کیا جائے تو اس کا کیا بدل دیا جائے ؟

جواب :-

خوشی ہوئی کہ آپ کو ملک سے بہر ایک ایسی جگہ کام کرنے کا موقع ملا ہے جہاں آپ اسلام کی بہت کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنی جگہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آپ پرسانہ مسلمانوں اور غیر مسلموں، سب کے سامنے حقیقی اسلام کی نمائندگی کے لیے مامور ہیں، اور اپنے قول و فعل سے اگر آپ نے ذرا بھی غلط نمائندگی کی تو بہت سے بندگانِ خدا کی گرامی کا ذہاں آپ کے اوپر ہو گا۔ اس احساس کے ساتھ اگر آپ یہاں رہیں گے اور حدِ استطاعت تک اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ایک مسلمان کی زندگی کا نمونہ بننے کی کوشش کرتے رہیں گے تو امید ہے کہ یہ آپ کی اپنی ترقی کے لیے بھی مفید ہو گا اور کیا عجیب کریم چیز آپ کے ہاتھوں بہت سے لوگوں کی ہدایت کا سبب بھی بن جائے جس کا اجر آپ کو خدا کے ہاں نصیب ہو۔

وہاں کے جو حالات مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوئے ہیں ان پر غور کرنے کے بعد میرے نزدیک کام کی جو صورتیں مناسب ہیں میں عرض کیے دیتا ہوں۔

مقامی زبان سیکھنے اور نوبلے کی مشق کریں اور صرف انگریزی پر اکتفا نہ کریں۔ غیر ملک میں جب باہر کا کوئی شخص مقامی لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں بات کرتا

ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور اس کی بات بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔  
 مقامی مسلمانوں کے ساتھ رابطہ مضبوط بنائیے۔ ان کو صحیح دین سمجھانے اور  
 اسلامی طور پر پتے سکھانے کی کوشش کیجیے۔ ان میں سے جن کے بچے آپ کے  
 مدرسے میں پڑھتے ہوں ان پر خاص توجہ کیجیے۔ تاکہ وہ آپ کو اپنا ہمدرد سمجھیں  
 دوسرے مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کو بھی اگر آپ ان کی تعلیم میں کچھ مدد دے  
 سکتے ہوں تو ضرور دیکھئے۔ جو لوگ آپ سے انگریزی پڑھنا چاہتے ہوں انہیں  
 پڑھائیے۔ اس طرح ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ پیدا کیجیے اور پھر ان کے اندر  
 دین کا صحیح علم و عمل پھیلانے اور ان کے حالات درست کرنے کی سبیل نکالیے  
 ان میں اگر کچھ با اثر آدمیوں سے تعلقات ہو جائیں تو انہیں مسلمانوں کے حالات کی  
 اصلاح کے طریقے بتائیے اور اخلاص و حکمت کے ساتھ کام کرنے پر ابھاریے  
 بے غرضی، محبت، تواضع اور حقیقی خیر خواہی کے ساتھ جب آپ ان کی بھلائی  
 کے لیے کوشاں ہوں گے تو دیر یا سویر، انشاء اللہ ایک دن آپ ان کے دل اپنی  
 مٹھی میں لے لیں گے اور وہ آپ کے کہے پر چلنے لگیں گے۔

جس مدرسے میں آپ کام کرتے ہیں وہاں اپنے طرز عمل سے اپنی اہمیت، فرض  
 شناسی اور بلند اخلاقی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کیجیے، یہاں تک کہ طلبہ اور اساتذہ  
 اور منتظمین سب پر آپ کا اخلاقی اثر قائم ہو جائے۔ پھر وہ راستے تلاش کیجیے  
 جن سے آپ غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ میں اپنے خیالات پھیلا سکیں۔ اس معاملہ میں  
 نایت درجہ تدبیر و دانائی کی ضرورت ہے۔ جو موقع بھی اسلام کی نمائندگی کا ملے اسے  
 ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ لیکن ایک قدم بھی غلط نہ اٹھائیے ورنہ نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

ہوں گے۔ طبیب کی دانائی اسی میں ہے کہ وہ مریض کو ٹھیک دوا کی خوراک بر وقت دے، نہ کم خوراک دے اور نہ زیادہ دے بیٹھے۔

عام لوگ جن سے آپ کامیل جمل ہوا ان سے اپنی گفتگو میں مناسب طریقے پر اسلام کا تعارف کرائیے۔ مغربی تہذیب کی کمزوریاں ان پر واضح کیجئے۔ میسائیت کی ناکامی اس حد تک انہیں سمجھائیے جس کے سننے کا ان میں تحمل ہو۔ پھر جن لوگوں میں اسلامی طریقہ پر پھرنے کی خواہش آپ پائیں ان کو مفید و شیرین شریعت کے لیے دیجئے۔ ہنگ پیدا کیے بغیر ہر ایک کو شریعت پر دنیا شروع نہ کر دیجئے۔ انگریزی شریعت کی فہرست آپ کو یہاں سے بھجوا دی جائے گی اسے منگو کر اپنے پاس رکھ لیں۔

غیر مسلموں میں سے جن کے اندر آپ خاص صلاحیت، سلامت طبع اور حق پسندی محسوس کریں ان سے ذاتی تعلقات بھی بڑھائیے اور ان پر خصوصیت کے ساتھ کام بھی کیجئے تاکہ اللہ انہیں ہدایت نصیب کرے۔ لیکن اپنے ہاتھ پر کسی کو مشرف باسلام کرنے سے پرہیز کیجئے۔ جو شخص بھی مسلمان ہونا چاہے اسے مقامی مسلمانوں کے پاس بھیجئے۔

شراب نوشی کے خلاف انگریزی میں بہت سا شریعت موجود ہے۔ آپ

(Church of England Temperance Society)

سے لندن کے پتہ پر (Anti Saloon League of

America) سے واشنگٹن کے پتے پر مراسلت کر کے اس موضوع کے متعلق شریعت کی فہرستیں منگوائیں اور مناسب کتابوں کا انتخاب کر لیں۔

اب مختصر طور پر آپ کے سوالات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

۱۔ دوسروں کی طرف سے اگر آپ کو دعوت دی جائے تو اس میں ضرور

شرکت کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر آپ ان کی اصلاح کے لیے اُن سے گھل مل نہ سکیں گے۔ اس نیت کے ساتھ اگر آپ ایسی مغفلوں میں شریک ہوں جہاں لوگ شراب پیتے ہوں تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں مواخذہ نہ ہو گا۔ آپ ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر غلابیہ نہ صرف یہ کہ شراب پینے سے پرہیز کریں بلکہ کھلم کھلا اس پرہیز کے معقول وجہ ہر پوچھنے والے کو ایسے طریقے سے سمجھائیں کہ اسے ناگوار خاطر نہ ہو۔ شرابیوں کی مغفل میں ان لوگوں کی شرکت تو بلاشبہ مضر ہے جو شراب نہ پینے پر شرماتے ہوں، لیکن اُن لوگوں کی شرکت بہت مفید ہے جو دھڑلے کے ساتھ شراب نوشی سے انکار کریں اور دلیل کی طاقت سے شراب پینے کی برائی وہیں اسی مغفل میں ان لوگوں کو سمجھانے پر آمادہ ہو جائیں جو ان سے شراب نہ پینے کے وجوہ دریافت کریں۔ یہ تو بہترین تبلیغ ہے جس پر میں خدا سے اجر کی توقع رکھتا ہوں۔

۲۔ ان کے صاف دھلے ہوئے برتنوں میں آپ کھانا کھاتے ہیں اگر آپ کو اطمینان ہو کہ وہ کسی حرام چیز سے مٹوث نہیں ہیں۔ اطمینان نہ ہونے کی صورت میں بہتر یہ ہے کہ آپ دعوت وصول ہوتے ہی اپنی اولیں فرصت میں داعی کو اپنے اصول اور مسلک سے آگاہ فرمادیں اور ان کو کچھ بھیجیں کہ آپ کے ساتھ دعوت میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے۔

۳۔ جن چیزوں میں الکوحل کی آمیزش ہو ان کا استعمال اس وقت تک نہ کرنا چاہیے جب تک کوئی طیب آپ کی جان بچانے کے لیے یا آپ کی صحت کو غیر معمولی نقصان سے بچانے کے لیے اس کا استعمال ناگزیر نہ تباہے۔



۴۔ آپ خود جن لوگوں کو مدعو کریں ان کو ہرگز شراب نہ پلائیں۔ دعوت دینے سے پہلے آپ کو انہیں آگاہ کر دینا چاہیے کہ آپ دعوت میں اپنے اصول کے خلاف کسی کو شراب نہیں پیش کر سکتے۔ اس شرط پر جو لوگ آپ کی دعوت قبول کریں صرف انہی کو مدعو کیجئے۔ شراب کا بدلہ پیش کرنا ہو تو پاکستان یا ہندوستان سے شربت روح افزا دیا الہی ہی کوئی اور خوش رنگ و معطر مشروب منگوائیجئے۔ امید ہے کہ وہ ان لوگوں کو بہت پسند آئے گا۔  
(ترجمان القرآن جلد ۵۴، عدد ۱۔ اپریل ۱۹۶۰ء)

## کیا روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود فدیہ دیا جاسکتا ہے؟

سوال ۱۔

یہاں کیل پور میں ایک صاحب علم نے پچھلے ماہ رمضان میں ایک فقہ کٹر کیا تھا کہ رمضان کے بارے میں سورۃ بقرہ کی آیات بیک وقت نازل ہوئی تھیں اس لیے اللہ نے شروع میں جو رعایت دی ہے کہ ”جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں“ اور پھر نہ رکھیں، تو وہ فدیہ ادا کریں“ یہ ایک اٹل رعایت ہے اور اب بھی اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کی حمایت میں ایک آیت ۱۸۳ کے آخری حصہ کو پیش کیا گیا کہ اگر روزہ رکھو تو بہتر ہے اور نہ رکھو تو فدیہ ادا کرو۔ اُن کا کہنا تھا کہ آیت ۱۸۳ پہلی آیات کے ساتھ ہی نازل ہوئی تھی نہ پہلی آیات کی رعایت

کو کیسے چھین سکتی ہے ۔

آپ کی تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آیات ۱۸۲ و ۱۸۳ تو جنگ بدر سے پہلے سترہ میں نازل ہوئیں اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی ۔ اگر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو پھر ان کے اس خیال کی تردید ہو سکتی ہے کہ آج بھی ایک تنہا دست ہشاکا انسان فدیہ دے کر روزے کی فرضیت سے بچ سکتا ہے ۔

مذکورہ بالا صاحب اپنے آپ کو علم حدیث کے استاد اور قرآن کے مفسر سمجھتے ہیں ۔ اور ہر دور کے متعلق اپنے افکار و خیالات دنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں ۔ آپ براہِ مہربانی کچھ تحریف گوارا کر کے ان کتب کا حوالہ دے دیں جن سے آپ کو ثبوت ملا ہو کہ آیات ۱۸۴ اور ۱۸۳ تو سترہ میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوئیں اور آیت ۱۸۴ ایک سال بعد نازل ہوئی ۔ اس طرح ہمارے پاس ایک سند ہو جائے گی اور ہم انہیں اپنے فاسد خیالات کی نشر و اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے ۔ یہ اسلام کی ہی خدمت ہے ۔ امید ہے کہ آپ ضرور ہمیں اپنے افکارِ عالیہ سے مستفید فرمائیں گے ۔

جواب :-

اس سوال میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نشا تو خود اس کے موضوع و مضمون ہی سے ظاہر ہے ۔ اس کے مصنف کا صاف مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغرضان میں روزے رکھنے کی ”مصیبت“ سے خود بھی بچیں اور ا۔

ہم مشرب "صاحب لوگوں" کو بھی بچائیں۔ عام فساد غیبت ہیں کہ کھلی کھلی نافرمانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور جو نافرمانی کرنا چاہتے ہیں اسے بے محابا کر گزرتے ہیں۔ ان میں کم از کم یہ مکاری موجود نہیں ہے کہ خدا کی نافرمانی کرنے کے لیے خود خدا ہی کی کتاب کو حجت بنائیں۔ لیکن نرالی قسم کے فتاق وہ ہیں کہ اپنے فسق و فجور کے لیے قرآن کو آڑ بناتے ہیں، اور قرآن سے یہ خدمت لینے ہی کے لیے انہوں نے اس کا رشتہ حدیث سے توڑا ہے تاکہ اس کی آیات کو جیسے چاہیں معنی پہنائیں، ان لوگوں کو آج کھلی چٹھی ملی ہوئی ہے۔ جس جس طرح چاہتے ہیں خلقِ خدا کو خدا کی کتاب کا نام لے لے کر خدا کے دین سے پھرتے ہیں۔ پہلے انہوں نے "دو قرآن" تصنیف کیے تھے۔ پھر "دو اسلام" وضع کیے۔ آگے چل کر یہ "دو خدا" بھی بنا ڈالیں تو کون ان کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے۔

روزوں کے بارے میں قرآن سے جو غلط استدلال انہوں نے کیلئے اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ زیر بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے :

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، کھو دیئے گئے تم پر روزے جس طرح رکھے گئے تھے تم سے پہلے کے لوگوں پر، تاکہ تم پر ہیز گاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا، پھر جو کوئی تم میں سے مرعین ہو، یا سفر پر ہو، تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے۔ اور جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضا کارانہ بجالاتے نیکی تو وہ بہتر ہے اسی کے لیے اور یہ کہ تم روزہ رکھو

یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر علم رکھتے ہو۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بنا کر انسانوں کے لیے اور روشن آیات لیے ہوئے ہوتا ہے اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پائے تم میں سے اس مہینے کو تو چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مرعین ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے۔“

(ملاحظہ فرمائیے سورۃ البقرہ رکوع ۲۲۔ اور اصل سے مقابلہ کر کے خوب

الہینان کر لیجئے۔ کہ اصل اور ترجمے میں معنی کے لحاظ سے کوئی فرق تو نہیں ہے۔)

اس عبارت کو جو شخص خالی الذہن ہو کہ ٹپسے گا۔ اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلہ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی۔ تو اس میں پہلے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لیے تم میں سے جو اس کو پائے اسے چاہیے کہ اس مہینے کے روزے رکھے! آخر یہ کیا انداز بیان ہے کہ پہلے کہا ”روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا“ پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کیے، پھر بتایا گیا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں اور رمضان کو اس کام کے لیے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ ایک مربوط سلسلہ تقریر میں شاید ایک انارٹھی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا، بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کیے گئے ہیں اور چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اس لیے یہ فرض روزے تم

اس پہلے میں رکھو۔ اس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہو گا کہ اس سلسلہ عبارت میں جب پہلے فقرہ آچکا تھا کہ ”جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے“ شمار دوسرے دنوں سے ”تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دہرانے کی کیا حاجت تھی؟ اور اگر فی الواقع اس کا دہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دہرایا گیا کہ ”جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا؟“ حقیقت میں ضرورت تو دندوں میں سے ایک کو بھی دہرانے کی نہ تھی، لیکن ایک کو دہرانا اور دوسرے کو نہ دہرانا تو ایک معما سا محسوس ہوتا ہے۔

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ ”ماہ رمضان وہ ہے“ سے پہلے کی عبارت اور اس کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے مرعاً متناقض نظر آتا ہے۔ پہلا مضمون صاف طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے، لیکن اگر وہ روزہ ہی نہ رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے، اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اس رعایت کا تو اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی، مگر اس رعایت کو ساقط کر دیا گیا جو اور پر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی۔ ایک معمولی عقل و غور رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ایک

ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے گا۔ پھر بھلا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے شایان شان کیسے ہو سکتا ہے ؟

پہلے دو سوالات صرف سوالات ہی ہیں۔ لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے، اہل میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لیے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے۔ جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں، اہل حدیث کو احکام دین کا ماتخذ اہل قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں، ان سے پوچھیے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے ؟

اب دیکھیے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآن مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے، ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو ”اے لوگو“ سے شروع ہو کہ ”اگر تم علم رکھتے ہو“ پر ختم ہوتا ہے، ابتداً نازل ہوا تھا، اہل دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا۔ البتہ مسافر اور مریض کے لیے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔ اس بیان میں نہ صرف یہ کہ سارے اشکالات رفع ہو گئے، بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اہل طبعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی ہے۔ اب بات سمجھ میں آگئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس نعمت

کے شکر یہ میں تم کو اس مہینے کے روزے ضرور رکھنے چاہئیں۔

محدثین و مفسرین نے یہ تشریح متعدد صحابہ اور تابعین سے نقل کی ہے۔ مثلاً  
 امام احمد بن حنبل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک طویل تشریح بیان نقل  
 کرتے ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نماز اور روزہ، دونوں کی موجودہ صورت  
 بتدریج قائم کی گئی ہے۔ نماز میں پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کیا جاتا تھا۔ پھر  
 مکہ کی طرف رخ پھیرا گیا۔ پہلے لوگ ایک دوسرے کو نماز کے وقت اطلاع  
 دیتے تھے پھر اذان کا طریقہ مقرر کیا گیا۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ اگر ایک شخص بیچ کے  
 کسی مرحلے پر اگر جماعت میں شریک ہوتا تھا تو اپنی نماز کا چھوٹا ہوا حصہ ادا کرنے  
 کے بعد امام کی پیروی شروع کرتا تھا۔ پھر یہ طریقہ مقرر کیا گیا کہ جماعت میں جس  
 مرحلے پر بھی اگر شریک ہو امام کی پیروی میں نماز پڑھنی شروع کر دو۔ پھر امام کے  
 سلام پھیر دینے کے بعد اٹھ کر اپنی نماز پوری کر دو۔ اسی طرح روزے کے احکام  
 بھی بتدریج آئے ہیں۔ جب بنی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ ہر مہینے  
 تین دن کے روزے رکھتے تھے، اور ایک روزہ محرم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے  
 پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کیے، مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے  
 وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے ضرور رکھے  
 جائیں۔ اور تندرست مقیم آدمی کے لیے خدیجہ کی رعایت منسوخ کر دی۔ پہلے لوگ  
 افطار کے بعد اس وقت تک کھانا پینا، مباشرت کرنا جائز سمجھتے تھے جب تک سو  
 نہ جائیں۔ سونے کے بعد وہ سمجھتے تھے کہ دن کا روزہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ  
 اس باب میں کوئی صریح حکم نہ تھا۔ مگر لوگ ایسا ہی سمجھے ہوئے تھے۔ بعد میں حکم آیا

لَكُمْ أَجَلٌ نَكْمَ لَيْلَةَ الْقِيَامِ الْوَفْتُ إِلَىٰ نَسَائِكُمْ إِلَىٰ قَوْلِهِ ثُمَّ  
 اتَّبَعُوا الْقِيَامَ إِلَىٰ اللَّيْلِ - (ابن کثیر - ج ۱ - ص ۲۱۴) -

اس مضمون کی تائید میں بخاری، مسلم، ابوداؤد احمد دوسرے محدثین نے متعدد روایات  
 نقل کی ہیں۔ جو حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت  
 سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ مشہور مفتی ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)  
 نے پوری سند کے ساتھ جن صحابہ ائمہ تابعین سے اس کی تائید میں روایات نقل کی ہیں  
 ان کے نام یہ ہیں، معاذ بن جبلؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، سلمہ بن اکوعؓ، علقمہؓ، عکرمہ  
 حسن بصریؓ، شعبیؓ، عطارؓ، زہریؓ۔ ان میں سے ایک روایت میں وہ حضرت معاذ بن جبل  
 کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے چونکہ اہل عرب روزوں کے عادی نہ تھے اور روزہ  
 ان پر سخت گراں گذرتا تھا۔ اس لیے ان کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ رمضان میں جس  
 دن روزہ نہ رکھیں اس دن کسی مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ بعد میں تاکید حکم آگیا کہ پورے  
 مہینے کے روزے رکھو لایہ کہ تم مریض ہو یا سفر پر ہو۔ ایک اور روایت میں وہ  
 ابن عباسؓ کی یہ تصریح نقل کرتے ہیں کہ پہلے سال کے روزوں میں اللہ تعالیٰ نے فدیے  
 کی رخصت رکھی تھی، مگر دوسرے سال جو حکم آیا اس میں مریض و مسافر کی رعایت تو  
 بحال تھی۔ لیکن مقیم کے لیے فدیے کی رعایت کا ذکر نہ تھا، اس لیے یہ رعایت  
 منسوخ ہو گئی۔

اس تشریح سے ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگ حدیث سے بے نیاز  
 ہو کر بلکہ احادیث کو حقارت اور لٹھیک کے ساتھ پھینک کر قرآن سے منہ ہٹانے  
 احکام کمال رہے ہیں وہ کس طرح خود گمراہ ہو رہے ہیں اور عام مسلمانوں کو گمراہ کر رہے  
 ہیں۔

(ترجمان القرآن رجب ۱۳۷۱ھ مطابق اپریل مئی ۱۹۵۲ء)۔



## جراہوں پر مسح

سوال :-

موزوں اور جراہوں پر مسح کے بارے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے  
میں آج کل تعلیم کے سلسلے میں سکاٹ لینڈ کے شمالی حصے میں مقیم ہوں یہاں  
جاڑے کے موسم میں سخت سردی پڑتی ہے اور اونٹنی جراب کا ہر وقت ہینٹا  
ناگزیر ہے کیا ایسی جراب پر بھی مسح کیا جاسکتا ہے ؟ براہ نوازش اپنی  
تحقیق احکام شریعت کی مدد میں تحریر فرمائیں۔

جواب :-

جہاں تک چڑے کے موزوں پر مسح کرنے کا تعلق ہے اس کے جواز پر قرعہ  
قریب تمام اہل سنت کا اتفاق ہے مگر سوئی اور اونٹنی جرابوں کے معاملے میں علماء ہمارے  
فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ موٹی ہوں اور شخاف نہ ہوں کہ ان کے نیچے  
سے پاؤں کی جلد نظر آئے اور وہ کسی قسم کی بندش کے بغیر خود قائم رہ سکیں۔  
میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ان شرائط کا ماخذ  
کیا ہے مگر سنت میں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی۔ سنت سے کچھ ثابت ہے وہ یہ  
ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ نسائی کے ہوا  
کتب سنن میں اور مسند احمد میں وغیرہ بن شعبہ کی روایت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ  
علیہ وسلم نے وضو کیا اور مسح غلی الجود ومبین والتعلین (اپنی جرابوں اور  
جوتوں پر مسح فرمایا)۔ ابو داؤد کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، براہ

ابن عازب، انس بن مالک، ابوامامہ، سہیل بن سعد اور ابن عمرؓ نے جرابوں پر مسح کیا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ فضا مروی ہے۔ بلکہ بیہقی اور طحاوی نے اس بن ابی اوس سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ اس میں جرابوں کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہی عمل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور صرف جوتے، اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر مسح کرنا بھی اُسی طرح جائز ہے جس طرح چڑھے کے مونروں پر مسح کرنا۔ ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فقہاء کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو، اور نہ یہی ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضورؐ نے اور مذکورہ بالا صحابہؓ نے مسح فرمایا وہ کس قسم کی تھیں۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ وہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اور فقہاء چونکہ شارع نہیں ہیں، اس لیے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گناہ نہیں ہو سکتا۔

اہم شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ جرابوں پر اس صورت میں آدمی مسح کر سکتا ہے جبکہ آدمی اوپنڈے پہنے رہے۔ لیکن اوپر جن صحابہ کے آثار نقل کیے گئے ہیں ان میں سے کسی نے بھی اس شرط کی پابندی نہیں کی ہے۔  
مسح علی الخفین پر غور کر کے میں نے جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل یہ تیمم کی طرح کی ایک سہولت ہے جو ہل ایمان کو ایسی حالتوں کے لیے دی گئی ہے جبکہ وہ کسی صورت سے پاؤں ڈھلکے رکھنے پر مجبور ہوں اور بار بار پاؤں دھونا ان کے لیے موجب نقصان یا وجہ مشقت ہو۔ اس رعایت کی بنا اس

مفروضے پر نہیں ہے کہ طہارت کے بعد منہ سے پین لینے سے پاؤں نجاست سے محفوظ رہیں گے اس لیے ان کو دھونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ اس کی بنا اللہ کی رحمت ہے جو بندوں کو سہولت عطا کرنے کی مقتضی ہوئی۔ لہذا ہر وہ چیز جو سردی سے یا راتے کے گرد و خوار سے بچنے کے لیے یا پاؤں کے کسی زخم کی حفاظت کے لیے آدمی پہنے اور جس کے بار بار اتارنے اور پھر پہننے میں آدمی کو زحمت ہو، اس پر مسح کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ اونی جراب ہو یا سوئی، چمڑے کا جوتا ہو یا کمرچ کا، یا کوئی کپڑا ہی ہو جو پاؤں پر لپیٹ کر باندھ لیا گیا ہو۔

میں جب کسی کسی کو وضو کے بعد مسح کے لیے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ بندہ اپنے خدا سے کہہ رہا ہے کہ ”حکم ہو تو ابھی یہ منہ سے کیلچ لول اور پاؤں دھو ڈالیں، مگر چونکہ سرکار ہی نے رخصت عطا فرمادی ہے اس لیے مسح پر اکتفا کرتا ہوں“ میرے نزدیک دراصل یہی معنی مسح علی الخفین وغیرہ کی حقیقی روح ہیں اور اس روح کے اعتبار سے وہ تمام چیزیں عجائباں ہیں جنہیں اُن ضروریات کے لیے آدمی پہنے جن کی رعایت ملحوظ رکھ کر مسح کی اجازت دی گئی ہے۔

(ترجمان القرآن - رمضان، شوال ۱۳۷۱ھ - جون، جولائی ۱۹۵۲ء)

# مُعاشرتی مسائل

## مہر غیر مؤجل کا حکم

سوالی :-

اگر بوقت ضرورت ذریعہ ہر کی صرف تعداد مقرر کر دی گئی اور اس امر کی تصریح نہ کی گئی ہو کہ یہ مہر معجل ہے یا مؤجل تو آیا اس کو معجل قرار دیا جائے گا یا مؤجل ؟ اس مسئلہ میں علماء سے استفسار کیا گیا مگر جواب مختلف آئے۔ مثلاً چند جوابات یہ ہیں :-

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلی کے مطابق :-

”اگر مہر میں مؤجل کی تصریح بھی ہو مگر اجل مجہول بجاہت فاحشہ ہو تو مہر معجل ہو جاتا ہے اور جبکہ معجل یا مؤجل کا لفظ استعمال نہ کیا جائے بلکہ واجب اللہ کا لفظ لکھ دیا جائے تو یہ بھی معجل ہو گا کیونکہ بغیر ذکر اجل کے مؤجل نہیں ہو سکتا۔ الا اذا اجعل الاجل جمالة فاحشة فيجب حالا غايه (در مختار) وان كانت جمالة متفاحشة كالى اليسرة“

الی هبوب الريح الى ان تملأ السماء ، فالاجل لا يثبت  
 وموجب السهو حالا - وكذا غامية البيان . (رد المحتار)  
 مولانا سعید احمد صاحب مدرس مدرسہ الاصلاح سرائے میرضلع اعظم  
 گڑھ ۔

”مہر مؤجل اس وقت ہوگا جب بوقت عقد نکاح ادائے مہر کے لیے  
 وقت اور تاریخ کی تعیین ہو ۔ یہی حال تمام معاملات کا ہے ۔ اگر کسی  
 نے ایک مکان سے کوئی چیز خریدی اور بات چیت میں تقدیر تاخیر  
 تعیین کا ذکر نہیں آیا تو یہ معاملہ بھی معجل کے حکم میں ہوگا ، مخیر یا خواہ  
 فورا قیمت دیدے یا بعد میں دینے کا وعدہ کرے ۔ بہر صورت معجل  
 میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوض فورا ادا کیا جائے بلکہ صاحب حق کو یہ  
 حق حاصل ہوتا ہے کہ فورا یا جب چاہے اپنے حق کا مطالبہ کرے اور  
 معاملہ مؤجلہ میں اجل اور تاریخ سے پہلے مطالبہ اور تقاضے کا حق  
 حاصل نہیں ہوگا ۔ اس تفصیل کی رو سے معاملہ مسئلہ میں زر مہر معجل ہے  
 اس لیے عورت جب چاہے اس کا مطالبہ فورا دعویٰ کر سکتی ہے ۔“  
 مولانا سید سلیمان ندوی :-

زر مہر میں اگر معجل یا مؤجل کی کوئی تفصیل نہیں ہے تو عرف کا اعتبار  
 کیا جائے گا ۔ وقایہ میں ہے والمعجل والمؤجل ان بینا  
 فذلک والا فالمتعارف ۔ اگر معجل اور مؤجل دونوں بیان کر دیے  
 گئے ہیں تو جیسا بیان کر دیا گیا ہے ویسا ہوگا ورنہ عرف کا اعتبار ہوگا ۔“

مولانا عبد الرحمن صاحب نائب منقی ریاست پٹیالہ و دیگر علماء :-

”اس صحت میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا (حوالہ دی ہی مختصر وقایہ کا ہے) اگر عرف یہ ہے کہ ایک عودت ایسے غیر مبین مہر کو صرف شوہر کی وفات یا طلاق ہی کے بعد حاصل کر سکتی ہے تو وہ شوہر کی وفات یا طلاق سے پہلے اسے وصول کرنے کا حق نہیں رکھتی“

اس اختلاف کا حل کیا ہے؟ براہ کرم آپ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب :-

قرآن و حدیث کی روش سے مہر دراصل اس حق زوجیت کا معاوضہ ہے جو ایک مرد کو اپنی بیوی پر حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے :-  
وَأَجَلَ لَكُمْ مَا قَدَاءَ ذَالِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِمَا مَوَّالِكُمْ  
(النساء - ۲۴)

ان کے ماسوا جو عودتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ اپنے مالوں کے عوض ان سے طلب نکاح کرو۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَلَهُنَّ أَجُورُهُنَّ فَرِيضَةً  
(النساء - ۲۴)

پس جو لطف تم نے ان سے اٹھایا ہے اس کے ان کے ہر بطور ایک فرض کے ادا کرو۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ (النساء ۳۱)

اے تم وہ مال کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم میں سے ایک دوسرے سے

اختلاف کر چکا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری وہ چیز ہے جس کے عوض مرد کو عورت پر شوہرانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ پھر اس کی مزید تصریح دہا حدیث کرتی ہیں جو اس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، جماع سکتہ اور دارمی اور سند احمد میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے ۱۔

أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج۔

تمام شرطوں سے بڑھ کر جو شرط اس کی مستحق ہے کہ تم اسے پورا کرو وہ شرط وہ ہے جس پر تم عورتوں کی شرمگاہوں کو حلال کرتے ہو،۔

بیعان کا وہ مشہور مقدمہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زوجین کے درمیان تفریق کرائی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ جب تفریق ہو چکی تو شوہر نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا مال مجھے واپس دلویا جائے، آپ نے جواب میں فرمایا ۱۔

لا مال لك ان كنت صدقت عليها فهو بما استحللت

من فوجها وان كنت كذبت عليها فذلك البعد لك منها

وسلم۔ کتاب البیان ۲۔

مال لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے

تو اس کی شرمگاہ جو تو نے اپنے لیے حلال کی تھی اس کے معاوضہ میں وہ مال

ادا ہو چکا، اور اگر تو نے اس پر مجباً اِزام لگایا ہے تو مال لینے کا حق تجھے سے  
 اور بھی زیادہ دہ ہو گیا۔ (مسلم۔ کتاب النکاح)  
 اس سے بھی زیادہ تصریح ایک اور حدیث میں ہے جو امام احمد اپنی مسند میں  
 لائے ہیں کہ :

من تزوج امرأة بصدق ونوى ان لا يوديه فهو زان .  
 جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ ہر دنیا نہیں ہے وہ  
 زانی ہے .

ان تمام نصوص سے ہر کی یہ حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی رسمی  
 وراثتی چیز نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جس کے معادضہ میں ایک عورت ایک مرد کے  
 لیے حلال ہوتی ہے۔ اور ان نصوص کا اقتضاد یہ ہے کہ استحلال فرج کے ساتھ ہی  
 پورا مہر فودا واجب الادا ہو جائے۔ البتہ کہ زوجین کے درمیان اس کو مؤخر  
 کر دینے کے لیے کوئی قرار دیا ہوگی ہو۔

پس نہ ہر کی ادائیگی میں اصل قبیل ہے نہ کہ تاجیل۔ مہر کا حق یہ ہے کہ وہ استحلال  
 فرج کے ساتھ بر وقت ادا ہو، اور یہ محض ایک رعایت ہے کہ اس کو ادا کرنے میں  
 مہلت دی جائے۔ اگر مہلت کے بارے میں زوجین کے درمیان کوئی قرار داد نہ  
 ہوئی ہو تو اعتبار اصل (یعنی قبیل) کا کیا جائے گا نہ کہ رعایت (یعنی تاجیل اور مہلت)  
 کا۔ یہ بات شارع کے فساد کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے کہ تاجیل کو اصل قرار  
 دیا جائے اور تاجیل و قبیل کے غیر مہر صرح ہونے کی صورت میں نہ ہر کو آپ سے  
 آپ مؤجل ٹھیرا یا جائے۔



فقہاء خفیہ کے درمیان اس مسئلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ  
 کے رائے وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ غایتہ البیان میں ہے:-

فان كان بشرط التعجيل او مسكوتا عنه يجب حالا ولها  
 ان تمنع نفسها حتى يعطيها اللهو -

اگر مہر بشرط تعجیل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو (کہ معجل  
 ہے یا مؤجل) تو وہ فوراً واجب ہوگا اور عورت کو حق ہوگا کہ اپنے آپ کو  
 شوہر سے روک لے جب تک وہ مہر ادا نہ کرے۔

اور شرح الفناہ علی البدایہ میں ہے:-

فان سمو المهر ساكتين عن التعجيل والتأجيل ماذا يكون  
 حكمه؟ قلت يجب حالا فيكون حكمه حكم ما شرط تعجيله -

پھر اگر مہر مقرر کر دیا گیا اور معجل یا مؤجل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا  
 تو اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ فوراً واجب ہوگا، اس کا حکم اُس  
 مہر کا سا حکم ہے جس کے لیے تعجیل کی شرط کی گئی ہو۔

اور اسبیحانی میں ہے:-

ان كان المهر معقلا او مسكوتا عنه فانه يجب حالا لان النكاح  
 عقد معاوضة وقد تعين حقه في الزوجة فوجب ان يتعين  
 حقها وذلك بالتسليم -

اگر مہر معجل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا، تو وہ فوراً واجب  
 ہوگا کیونکہ نکاح ایک عقد معاوضہ ہے، جب زوجہ پر جو ہر کچھ متعین

ہو گیا تو واجب آیا کہ محدث کا حق بھی سب سے ہو جائے اور وہ اسی طرح ہو  
سکتا ہے کہ ہر آدمی کو دیا جائے۔

ہر آدمی کو دیا جائے، تو وہ کہتا ہے کہ اس معاملہ میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا  
فنادی قاضی خاں میں ہے :-

فمن لم یسئلوا قدر المعجل ینظروا الی المواتة والی المهر امنہ  
کم یمکن المعجل مثل هذه المواتة من مثل هذا المهر  
فیجعل ذلک ولا یتقدر بالربع والخمس بل یمتد  
للتعاقب۔

مگر معجل کی مقدار واضح نہ کی گئی ہو تو دیکھا جائے گا کہ قدرت کس طبقہ کی  
ہے اور ہر کتنا ہے اور یہ کہ ایسی قدرت کے لیے ایسے ہر میں سے کس  
قدر معجل قرار دیا جائے۔ بس اتنا ہی مقدار معجل قرار دی جائے ایک چوتھائی  
یا پانچویں حصہ کی تعیین ذکر کرنی چاہیے جو رواج ہو اس کا اعتبار کرنا  
چاہیے۔

اسی دلائل کی تائید علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے وہ لکھتے ہیں  
وان لم یشرط تعجیل شیء بل سکتوا عن تأجیلہ وتعجیلہ  
فمن کان عرف فی تعجیل بعضہ وتأخیر باقیہ الی الموت اور  
المیوة او المطلق فلیس لہا ان تعتبس الا الی تسلیم ذلک  
القدر۔

اور اگر کسی حصہ ہر کی تعجیل کی شرط نہ کی گئی ہو بلکہ تعجیل اور تاخیر کے بارے

میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو رواج کو دیکھا جائے گا۔ اگر یہ رواج ہے کہ ایک حصہ معجل قرار دیا جاتا ہے اور باقی حصہ موت تک یا خوشحالی یا طلاق تک مؤخر رکھا جاتا ہے تو عورت صرف اتنی ہی مقدار وصول ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے روکنے کا حق رکھتی ہے۔

اصولی حیثیت سے دیکھا جائے تو پہلے گروہ کی رائے قرآن و حدیث کے فحش سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کی رائے بھی بے فذن نہیں ہے۔ ان کے قول کا مدعا یہ نہیں ہے کہ مہر کے باب میں تاویل اصل ہے اور جب تاویل و تعہیل کی مراحط نہ ہو تو معاملہ اصل یعنی تاویل کی طرف راجع ہونا چاہیے بلکہ وہ اپنے فتوے میں ایک اور قاعدے کا لحاظ کرتے ہیں جسے شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ امدودہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں معاملات کے متعلق جو طریقہ عام طور پر مروج ہو اس کی حیثیت افراد کے درمیان ایک بے شک معاملے کی سی ہوتی ہے، اگر اس سوسائٹی کے دو فریق باہم کوئی معاملہ طے کریں اور کسی خاص پہلو کے بارے میں بعراحت کوئی قرار داد نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس پہلو میں وہ مروجہ طریقہ پر راضی ہیں۔

بلاشبہ یہ قاعدہ شریعت میں مسلم ہے، اور اس لحاظ سے فقہاء کے دوسرے گروہ کی رائے بھی غلط نہیں ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم کسی خاص سوسائٹی میں اس قاعدے کو جاری کریں، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت نے رواج بطور ایک ماخذ قانون (Source of Law) کے تسلیم نہیں کیا ہے کہ جو چہرہ دون ہو وہی شریعت کے نزدیک حق ہو، بلکہ اس کے برعکس وہ غیر متقی سوسائٹی اور

اس کے غیر متعناذ رواجوں کو قبول کرنے کے بجائے ان کو بدلنا چاہتی ہے اور صرف ان رواجوں کو تسلیم کرتی ہے جو ایک اصلاح شدہ سوسائٹی میں شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ لہذا رواج کو بے لکھا معاہدہ مان کر مثل قانون نافذ کرنے سے پہلے، دیکھنا ضروری ہے کہ جس سوسائٹی کے رواج کو ہم یہ حیثیت دے رہے ہیں کیا وہ ایک متقی سوسائٹی ہے؟ اور کیا اس کے رواج شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کی پیروی میں پیدا ہوئے ہیں؟ اور تحقیق سے اس کا جواب نفی میں ملے تو اس قاعدے کو مثل قانون جاری کرنا عدل نہیں بلکہ قطعاً ایک ظلم ہوگا۔

اس نقطہ نظر سے جب ہم اپنے ملک کی موجودہ مسلم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تعلقات مرد و زن کے معاملہ میں اس نے خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر کے بس توازن کو بہت کچھ بگاڑ دیا ہے جو شریعت نے قائم کیا تھا، اور بالعموم اس کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہے جو شریعت کی روح اور اس کے احکام سے مرعاً مغرف ہیں۔ اسی مہر کے معاملہ کو لے لیجئے جس پر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ اس ملک کے مسلمان بالعموم مہر کو محض ایک رسمی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اس کی وہ اہمیت، قطعاً نہیں ہے جو قرآن و حدیث میں اس کو دی گئی ہے۔ نکاح کے وقت بالکل ایک نمائشی طور پر مہر کی قرارداد ہو جاتی ہے مگر اس امر کا کوئی تصدیق دہنوں میں نہیں ہوتا کہ اس قرارداد کو پورا بھی کرنا ہے۔ بارہا ہم نے مہر کی بات چیت میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ ”میاں کو ان لیتا ہے کون دیتا ہے“ گویا یہ فعل ضابطہ کی خانہ پُری کے لیے

کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علم میں ۸۰ فیصدی نکاح ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر کے  
سے کبھی ادا ہی نہیں کیا جاتا۔ زبرد مہر کی مقدار مقرر کرنے میں اکثر جو چیز لوگوں کے  
پیش نظر ہوتی ہے وہ صرف یہ کہ اسے طلاق کی روک تھام کا ذریعہ بنایا جائے  
اس طرح عملاً عورتوں کے ایک شرعی حق کو کالعدم کر دیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی  
پروا نہیں کی گئی کہ جس شریعت کی رو سے یہ لوگ عورتوں کو مردوں پر حلال کرتے  
ہیں وہ مہر کو استحصالی فروج کا معاوضہ قرار دیتی ہے اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی  
نیت نہ ہو تو خدا کے نزدیک عورت مرد پر حلال ہی نہیں ہوتی۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جس سوسائٹی کا عرف اتنا بگڑ چکا ہو اور  
جس کے رواج نے شریعت کے احکام اور اس کی روح کے بالکل خلاف صورتیں  
اختیار کر لی ہوں، اس کے عرف و رواج کو از روئے شریعت جائزہ قرار دینا  
کس طرح ہو سکتا ہے۔ جن فقہار کی عبارتیں اعتبار عرف کی تائید میں نقل کی جاتی  
ہیں، ان کے پیش نظر نہ یہ بگڑی ہوئی سوسائٹی تھی اور نہ اس کے خلاف شریعت  
رواج۔ انہوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ ایک اصلاح شدہ سوسائٹی اور اس کے عرف  
کو پیش نظر رکھ کر لکھا تھا۔ کوئی مفتی مجرّد ان کی عبارتوں کو نقل کر کے اپنی ذمہ داری  
کے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اصول شریعت  
کی روشنی میں ان کی عبارتوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور یہ تحقیق کر لے کہ جن حالات  
میں انہوں نے وہ عبارتیں لکھی تھیں ان سے وہ حالات مختلف تو نہیں ہیں جن پر  
آج چسپاں کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب۔ شعبان ۱۳۶۲ھ، جولائی۔ اگست ۱۹۴۱ء)

## غیر محرم قریبی اعزہ سے پردہ کی صورت

سوال ۱۔

کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو شرعی بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ کہ سسرال اور میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہمارے آج کل کے نظام معاشرت میں بالعموم عورتیں پر وہ نہیں کرتیں، ان سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیے تو کن حدود کے ساتھ؟

جواب ۱۔

شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کا بیوی کو حکم دے۔ اور اگر وہ ایسا حکم دے تو ایک مسلمان عورت کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ سورہ نور کے رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ نے ان رشتہ داروں کی فہرست دے دی ہے جن کے سامنے ایک مسلمان عورت اپنی زینت کے ساتھ آ سکتی ہے۔ ان کے سوا کسی کے سامنے اظہار زینت کا حکم دینا کسی مسلمان کے رازہ اختیار سے باہر ہے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہن رہیں ہوتا ہے ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بالکل غیر مردوں سے پردہ کی نوعیت ہے۔ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے بغیر زینت کے سادہ لباس میں، پورے ستر کے ساتھ آ سکتی ہیں، مگر صرف اس حد

نہ ان کے سامنے رہنا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو۔ یہ غلط اور بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر منہی مذاق کرنا اور تنہائی میں بیٹھنا، جس کا رواج ہماری موجودہ سوسائٹی میں بڑی کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے، شرعی احکام کے قطعی خلاف ہے، اور بعض رشتہ داروں مثلاً دیہوں کے ساتھ ایسے تعلقات کی توقع ریش میں مریخ ممانعت موجود ہے۔

اس معاملہ میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ شریعت کا جو حکم ہے وہ میں نے بتا دیا ہے۔ مگر مسلمانوں میں مطہج سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے بڑی جرات اور عزم کی ضرورت ہے۔ ایک طرف بخت مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں جو شریعت کے مطالبات سے بڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف وہی لوگ رشتہ داروں کے ساتھ تمام حدود شرعیہ توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں مگر کوئی شخص احکام شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل نہ آکر ناچا ہے تو شاید بہت سے خاندانی تعلقات کو توڑے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔

(ترجمان القرآن، رجب، شعبان ۱۳۵۷ھ - جولائی، اگست ۱۹۳۷ء)

## پردہ کے متعلق چند عملی سوالات

سوال :-

آپ کی کتاب "پردہ" کے مطالعہ کے بعد میں نے اند میری ایسے

چند بہنوں سے عائلی زندگی کو قوانین البیہ کے مطابق بندنے کی سعی شروع کر رکھی ہے۔ مگر ہمارے اس جدید رویہ کی وجہ سے پورا خاندان بالخصوص ہمدرد والدین محنت، پیہم ہیں اور پردہ کو شرعی حدود و ضوابط کے ساتھ اختیار کرنے پر ہدفِ روختہ ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ کہیں ہم ہی بعض مسائل میں غلطی پر نہ ہوں۔ پس تسلی کے لیے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتے ہیں۔

- (۱) سودا اعزاب کی یہ آیت کہ ”مرد قوں پر کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپوں کے سامنے پردہ نہ کریں اور نہ اپنے بیٹوں کے سامنے ....“ ۶۱“ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ آیت میں جن اعتراض کا ذکر ہے ان کے سوا مرد قوں کا کسی دوسرے کے سامنے کسی بھی شکل اور حالت میں آنا (الغیر محرم، عریضہ، عریضہ) اس معاملہ میں غیر محرم رشتہ دار اور غیر محرم اجانب، نکلے، رابر ہیں۔ کیا سیرا خیال صحیح ہے؟
- (۲) کیا غیر محرم اقربہ (مثلاً چچا زاد بھائی یا خالو جب خالہ زندہ ہوں) کے سامنے ہونا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کن مواقع کے لیے اور کن طریقوں کے ساتھ جائز ہے؟

- (۳) اگر کچھ غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ ایک ہی مکان میں مجبوراً رہنا ہو یا کوئی غیر محرم عزیز الملہ بہانہ اسے تو ایسی حالت میں پردہ کس طرح کیا جائے؟ اسی طرح کچھ قریبی عزیز کے ہاں رہنے پر اگر نہانے سے اجازت آنے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟

- (۴) مگر گھروں میں جو ان عازم کام کاج کے لیے آئیں جائیں تو سن رسیدہ مرد قوں



عورتوں کے لیے توجہ و رخصت ہے وہ مجھے معلوم ہے مگر جو ان عورتیں کیا صرف یہ کہہ کر ان کے سامنے بے پردہ ہو سکتی ہیں کہ ہماری نیت پاک ہے؟  
(۵) اگر خطہ رسول کے احکام کے تحت پردہ اختیار کرنے میں کسی کی والدہ آحائل ہو تو اس کے حکم کو رد کیا جاسکتا ہے یا نہیں، چکہ آپ کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔

(۶) کیا عورتوں کو موبل اند عورتوں کے مشترکہ جلسوں میں نقاب اندھ کر تقریر کرنی جائز ہے؟ حدیث کی رو سے تو عورتوں کی آواز کا غیر محرم مردوں تک پہنچنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا۔

(۷) کیا عورتیں ٹیڈی ڈاکٹر یا نرس یا ملکہ بن سکتی ہیں؟ جیسا کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے لیڈروں نے قوم کو اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری عورتیں سب کاموں میں حصہ لے کر گزشتہ نقصانات ادا پسندگی کی تلافی کریں۔ اسی نقطہ نظر سے عورتیں کیا ان مشاغل کو اختیار کر سکتی ہیں اور آیا انہیں پردہ میں رہ کر ہی انجام دینا ہو گا یا ضرورت پردہ سے باہر بھی آ سکتی ہیں؟

(۸) کیا عورتیں چہرہ کھول کر یا نقاب کے ساتھ جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں؟

جواب :-

(۱) آپ نے قرآن مجید کے اصل الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ آیت جس کا حوالہ آپ دے رہے ہیں سورہ احزاب میں نہیں ہے بلکہ سورہ نساء میں ہے

اور اس میں الفاظ یہ ہیں کہ ”وَلَا يُبْدِيَنَّ فَرْسَتَهُنَّ إِلَّا.....“ یعنی بجز ان لوگوں کے اہل کسی کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ دوسرے نفلوں میں گھر سے باہر بناؤ شگھار اور آرائش کے ساتھ غیر محرم لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔ دوسری طرف گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ”يُذْهِبْنَ عَنْهُمْ مِنْ جَلَاءَ بَيْنَهُنَّ.....“ یعنی اپنی چادروں کو اپنے اوپر گھونگھٹ کے طور پر لٹکالیا کریں۔ ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی تین قسمیں ہیں اہل ہر قسم کے لیے الگ احکام ہیں۔ ایک وہ محرم رشتہ دار وغیرہ جن کا ذکر سورہ نساء والی آیت میں آیا ہے۔ دوسرے ہانکل اجنبی لوگ جن کا حکم سورہ احزاب والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ تیسرے ان دونوں کے درمیان ایسے لوگ جن کا حکم نہیں ہیں اور اجنبی بھی نہیں۔ پہلی قسم کے مردوں کے سامنے عورت اپنے بناؤ شگھار کے ساتھ آسکتی ہے۔ دوسری قسم کے مردوں کو چہرہ تک نہیں دکھا سکتی۔ رُسے تیسری قسم کے لوگ تو ان سے پردے کی نوعیت مذکورہ بالا دونوں محدثوں کے درمیان رہے گی۔ یعنی نہ تو ان سے ہانکل اجنبیوں کا سا پردہ ہوگا اور نہ ان کے سامنے زینت کا اظہار ہی کیا جائے گا۔

(۲) سامنے ہونے کے مد مطلب ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اُس طرح کی آزادی اور بناؤ شگھار کے ساتھ سامنے ہونا جیسے باپ بھائی وغیرہ کے سامنے ہوا جاتا ہے، اہل بے تکلف بیٹھ کر بات چیت کرنا، ہنسنا، بولنا، حتیٰ کہ تنہائی تک میں ساتھ رہنا۔ یہ چیز کسی قسم کے غیر محرم مردوں کے ساتھ بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ اجنبی ہوں یا رشتہ دار۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ

عورت اپنی زینت کو چادر وغیرہ سے چھپا کر، نیز سر کو ڈھانک کر صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے ہوئے کسی کے سامنے آئے، اور وہ بھی اپنے آپ کو دکھانے کی غرض سے نہیں بلکہ اُن ناگزیر مردوں کو پورا کرنے کی غرض سے جو مشترک خاندانی معاشرت میں پیش آتی ہیں۔ مگر آزادی کے ساتھ بیٹھ کر غلامانہ کرے۔ خلوت میں بھی اس کے ساتھ نہ رہے، اور صرف اس طرح سامنے ہو کہ مثلاً اس کے سامنے سے گذر جائے یا کوئی فردی بات ہو تو پوچھ لے یا بتا دے۔ اس حد تک غیر محرم اعزہ کے سامنے ہونے کی شرعاً اجازت ہے یا کم از کم ممانعت نہیں ہے۔ بہر حال چھاپا زاد بھائیوں اور خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ جو ہنسی مذاق اور انتہائی بے تعلقی آج مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہے اور جس طرح مسلمان لڑکیاں اس قسم کے عزیزوں کے سامنے بنی ٹھنی رہتی ہیں، شریعت اسلامیہ میں ان بے اعتدالیوں کے لیے کوئی دُعا جواز نہیں ہے۔

(۳) ایسے حالات میں اگر شریعت کی پابندی کا ارادہ دونوں طرف موجود ہو تو صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جب کوئی غیر محرم عزیز گھر میں آئے تو شرعی قاعدہ کے مطابق استیذان (طلب اجازت) کرے۔ پھر جب ایسی آواز آئے تو عورت کو

۱۔ افسوس ہے کہ قرآن و سنت کے حکم استیذان کو آج مسلمانوں نے اپنی معاشرت سے بالکل ہی خارج کر دیا ہے اور اجازت مانگے بغیر گھر میں گھس آئے کو بے تعلقی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ شرعاً خود گھر کے مردوں، حتیٰ کہ باپوں، بیٹوں اور بھائیوں کو بھی لازم ہے کہ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگیں تو کم از کم کھٹکار دیں یا کوئی ایسی آواز (بقیہ صفحہ ۸۴ پر)

چاہیے کہ کوئی چیز اڑھ کر اپنی زینت کو چھپائے اور ذرا اپنا رخ بدل لے اور پیٹھ موڑ لے۔ اگر بالکل ناگزیر ہو تو چہرہ اور ہاتھ غیر محرم عزیبہ کے سامنے ظاہر ہونے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح بعورت سادگی کے ساتھ بات کر لینے میں بھی کوئی عرج نہیں ہے۔ البتہ غلاما اور بے تکلفی اور سنہی مذاق بالکل ناجائز ہے۔

(۴) ملازموں کے معاملہ میں میری تحقیق یہ ہے کہ جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی رائے یہ ہو کہ وہ ”غَیْرِ اُولٰی الْاِذْبَہِ“ کی تعریف میں آتے ہیں (یعنی اپنے آقا کے گھر کی عورتوں کے متعلق کوئی برا خیال ان کے دل میں آنے کی توقع نہیں ہے) ان کو گھر میں آنے جانے اور کام کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ لیکن جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی یہ رائے نہ ہو، ان کا گھروں میں آنا ناجائز نہیں ہے۔ بہر حال اس معاملہ میں گھر کے قوام کا اجتہاد معتبر ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے پابندی کا ارادہ رکھتا ہو، نہ کہ حد و شریعت کو بے پروائی کے ساتھ ٹالنے والا ہو۔

(۵) ماں کے پاؤں کے نیچے جنت بے شک ہے، لیکن حکم حرف اُمسی ماں کا مانا جاسکتا ہے جو جنتیوں کے سے کام کرے، یعنی خدا و رسول کے احکام کے آگے جھکنے والی ہو اور اپنے نفس یا خانگاہی رواجوں پر شریعت کو قربان کر دینے والی نہ ہو۔ رہی وہ ماں جو اس کے برعکس صفات رکھتی ہو تو اس کی

کدیں جس سے گھر کی عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی مرد آ رہا ہے۔

خدمت تو کی جاتی رہے گی، مگر غیر شرعی امور میں اس کی اطاعت نہیں کی جاسکتی  
 شریعت کی پابندی سے آزاد ہو کر خدا اپنے نفس یا بھادی کی شریعت کو خدا  
 کی شریعت پر ترجیح دے کر تو اس نے اپنا قدم خود جہنم کی طرف ڈال دیا۔ پھر  
 آخر اس کے ہاڈوں کے نیچے جنت کیسے ہو سکتی ہے۔

(۶) بعض حالات میں یہ چیز جائز ہے کہ عورت پر دسے کی پوری پابندی  
 کے ساتھ مردوں کو خطاب کرے، لیکن بالعموم یہ جائز نہیں ہے۔ اس امر کا  
 فیصلہ کہ ناکہ کن حالات میں یہ چیز جائز ہے اور کن میں جائز نہیں، صرف ایسے  
 شخص یا اشخاص کا کام ہے جو مواقع اور حالات کو شرعی نقطہ نظر سے سمجھنے کی  
 اہلیت بھی رکھتے ہوں اور شریعت کے فساد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی  
 نیت بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

(۷) لیڈر صاحبان کا حوالہ دے کر آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا  
 مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب اسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی یہ  
 حضرات خود اور ان کے اتباع میں مسلمان آج کل کر رہے ہیں تو پھر اسلامی تہذیب  
 اور یورپین تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر تو مبلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا  
 چاہیے جو آج کل یورپ میں ہو رہا ہے لیکن اگر اسلامی تہذیب اُسی تہذیب کا  
 نام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی تو آج کل کے میڈیکل کالجوں اور  
 نرسنگ کی تربیت گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجہ  
 بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے۔ رائج الوقت گریز کالجوں میں  
 جا کر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معاملات بننے کا معاملہ بھی اس سے کچھ بہت مصلحت نہیں

ہے۔ البتہ اگر نظام تعلیم و تربیت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے طریقہ پر لڑکیوں کو تیار کر کے ان سے تمدن کے ضروری کاموں کی خدمت لینے پر قادر ہوں تو یقیناً ہم اس کا انتظام کریں گے کہ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے لڑکیوں کو فن طب، سرجری، قابضہ گری، نرسنگ اور تربیت اطفال کی تعلیم دیں اور ان کو دوسرے علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم و تربیت دے کر معاشات بھی بنائیں اور ان سے تمدن کی دوسری مختلف ضروری خدمات بھی ایسے طریقوں پر لیں جو اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ضماً لائق تکرار ہے کہ ہم مسلمان اس مغربی نظریہ کے قائل نہیں ہیں کہ تیار داری (نرسنگ) کا پیشہ عورت کے لیے مخصوص ہے اور یہ کہ زنانہ مردانہ سب قسم کے ہسپتالوں میں نرس عورت ہی ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس خیال کے لیے کوئی علمی اور عقلی بنیاد نہیں ہے، اور اخلاقی حیثیت سے یہ نہایت شرمناک ہے کہ نرس خواتین سے فرد بیماروں کی تیار داری کے وہ کام لیے جائیں جنہیں مرد تیار دار بھی انجام دیتے ہوئے حجاب محسوس کریں۔ اس بنا پر ہم مسلمان لوگ اگر عورتوں کو طبی خدمات کے لیے تیار کریں گے تو عورتوں کے علاج اور تیار داری کے لیے کریں گے نہ کہ عام طبی خدمات کے لیے۔ ہمارے نزدیک مردانہ ہسپتالوں کے لیے مرد ہی نرس ہونے چاہئیں۔

(۸) جنگ کے موقع پر تیار داری، مرہم پٹی، بجاہدوں کا کھانا پکانا، اسلحہ اور رسد رسانی، پیغام رسانی وغیرہ کی خدمات انجام دینا عورتوں کے لیے جائز ہے۔ پردے کے احکام سے قبل بھی یہ خدمات عورتیں انجام دیتی تھیں اور ان احکام کے آنے کے بعد بھی دیتی رہیں اور آج بھی دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ

جواز اس شرط سے ہے کہ فوج اسلامی ہو، صلہ اللہ کی پابند ہو اور ان بدشعروں سے پاک ہجرت میں آج کل کی فوجوں نے ناموری حاصل کر رکھی ہے (۷۷-۸۰-۱) جیسے معصوم ناموں سے عورتوں کو بھرتی کرنا اور پھر بد معاش سپاہیوں اور افسروں کے لیے ان سے قہر گری کی خدمت لینا وہ شیطانی کام ہے جس کے لیے کوئی گنجائش برائے نام بھی اسلامی تہذیب میں نہیں مل سکتی۔  
(ترجمان القرآن - رمضان ۱۳۶۵ھ - اگست ۱۹۴۵ء)

## رسموں کی شریعت

### سوال ۱۔

چند اشکال پیش ہیں۔ ان کے متعلق شرعی رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ آج کل کی فوجوں کی اخلاقی حالت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم کے سلسلے میں اریگی فوج نے جاپان میں ایک لاکھ، انگلستان میں ۱۰ ہزار اور جرمنی میں ۵۰ ہزار عوامی بچے چھوڑے ہیں۔ اور روسی فوج نے صرف مشرقی برلن میں ۱۶ ہزار عوامی اولاد پیدا کی ہے۔ یہ صرف ان بچوں کی تعداد ہے جو ۱۹۵۲ء کے آخر تک شہر میں آگئے ہیں۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس برتھ کنٹرول کے دور میں کتنے بچے پائے پر بدکاری کی گئی ہوں گی تب جا کر یہ نتائج بدظہور میں آئے۔

۱۔ ایک مفلس مسلمان اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ افلاس کے باوجود دنیا والوں کا ساتھ دینے کا بھی خواہشمند ہے، یعنی شادی فوراً ترک و احتشام سے کر کے وقتی سی مسترت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رہنمائی کیسے کی جائے ؟

ب۔ ایک مفروض مسلمان جو تمام آئمانہ بیچ کر بھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، بیٹے، بیٹیوں کی شادی کرنا چاہے تو فریق ثانی کی طرف سے ایسی شرائط سنانے آتی ہیں جو ہر حال صرف کثیر چاہتی ہیں تو اس کے لیے کیا راہ عمل ہے ؟

ج۔ عموماً لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ دوسری طرف سے نسبت کے پیغام میں پہل ہو، چنانچہ اسی انتظار میں بعض اوقات لڑکیاں جوانی کو ملے کر کے بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوتی ہیں اور کنواری رہ جاتی ہیں۔ اس معاملہ میں اسلام کیا چاہتا ہے ؟

د۔ موجودہ مسلمان شادی بیاہ، پیدائش اور موت کی تقریبات پر چھٹی، چٹہ، باجر، گنگنی، جینیز اور اسی طرح پالمیو، قل، وغیرہ کی جھڑوم انجام دیتے ہیں ان کی حیثیت شریعت میں کیا ہے ؟

جواب :-

۱۔ ایسا شخص جو خود جانتا ہے کہ وہ اتنا خرچ کرنے کے قابل نہیں ہے، اور پھر محض دنیا کے دکھاوے اور اپنی غلط خواہشات کی تسکین کی خاطر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا چاہتا ہے وہ تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو معصیت کے



گڑھے میں پھنک رہا ہے۔ اپنی غلط خواہش کی وجہ سے یا تو وہ سودی قرض لے گا یا کسی مہمند کی جیب پر ڈاکہ ڈالے گا، اور اگر اسے قرضِ حسن مل گیا جس کی امید نہیں ہے، تو اُسے مار کھائے گا۔ اور اس سلسلہ میں خدا جانے کتنے جھوٹ اور کتنے بے ایمانیاں اس سے سرزد ہوں گی۔ آخر ایسے شخص کو کیا سمجھایا جاسکتا ہے جو محض اپنے نفس کی ایک غلط خواہش کی خاطر اتنے بڑے گناہ جانتے ہو جتے اپنے سر لینے پر آمادہ ہے۔

ب۔ ایسے شخص کو اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں ان لوگوں میں کرنی چاہئیں، جو مالی حیثیت سے اُسی جیسے ہوں اور جو اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی چادر سے نہ وہ خود زیادہ پاؤں پھیلا میں اور نہ دوسرے کو زیادہ پاؤں پھیلائے پر مجبور کریں۔ اپنے سے بہتر مالی حالات رکھنے والوں میں شادی بیاہ کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشکلات میں مبتلا کرنا ہے۔

ج۔ یہ صورت تو کچھ فطری سی ہے، لیکن اس کو حد سے زیادہ بڑھانا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی لڑکی جو ان اور شادی کے قابل ہو چکی ہو اور کوئی مناسب لڑکا نظر آئے، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی طرف سے پیغام دینے کی ابتدا کرے۔ اس کی مثالیں خود صحابہ کرام میں ملتی ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت میں کوئی نکتہ کی بات ہو تو نبی صلعم اس کو منع فرما دیتے۔

د۔ یہ سب چیزیں وہ پھندے ہیں جو لوگوں نے اپنے گلے میں خود ڈال لیے ہیں، ان میں پھنس کر ان کی دلدلگی اب تنگ ہوئی جا رہی ہے، لیکن دنیا جہالت اور نادانی کی وجہ سے ان کو کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہونے

اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ براہ راست ان رسموں کے خلاف کچھ کہا جائے، بلکہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف دعوت دی جائے۔ خدا اور رسول کے طریقہ پر لوگ آجائیں تو بڑی خرابیاں بھی دور ہوں گی اور یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی نہ رہیں گی۔

### سوال :-

میں عرضہ سے تہجد کی زندگی گزار رہا ہوں اور اس سبب کی ذمہ داری میرے ”اجتہاد“ کے سر ہے۔ ہمارے اطراف میں کچھ اس قسم کے اصول و مراسم شائع ہیں جن کے بارے میں اگر فقہی موشگافیوں سے کام لینا شروع کر دیا جائے تو ان کو ”نا جائزہ“ اور ”غیر شرعی“ کہنا مشکل ہو گا۔ مثلاً یہ کہ فسوس یا مکتوحہ کے لیے زیور و پارچہ جات کا مطالبہ کچھ آپس کے لین دین، ایک دوسرے کے کمینوں اور خدمت گاروں کو بطور عطیہ و انعام کچھ دنیا دلانا، برادری اور اہل قرابت کو بلانا اور ان کی ضیافت کرنا وغیرہ۔ یہ بہت سی چیزیں نظر ہر اگر علینیدہ علیحدہ کر کے دیکھی جائیں تو ان میں سے غالباً کسی ایک کو بھی نا جائز نہ کہا جاسکے گا۔ لیکن اگر ان مراسم کے اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ان کی پابندی بعد الزام اس حد تک ہے کہ ان کے بغیر کامیابی ہی نہیں ہوتی اور کوئی کسی وجہ کا آدمی کیونہ نہ ہو۔ ان کی پابندی قبول کیے بغیر ازدواجی زندگی کا آغاز نہ ہی نہیں سکتا تو بالکل صفائی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چیزیں اب صرف

”مباح“ کے درجہ پر باقی نہیں رہی ہیں، بلکہ یہ سب برادری کا ایک قانون بن گئی ہیں اور ایسا قانون کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والا گویا مجرم مقصود ہوتا ہے پس حبس ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر باطل قانون کو توڑ دیا جائے، چاہے وہ کہیں ہو، تو سوا یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا چیزیں اس شکست و سختی کی مستحق ہیں یا نہیں؟ اگر یہ جملہ کی مستحق ہیں، جیسا کہ میری رائے ہے تو کیا یہ حقیقت آپ سے مخفی ہے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اس قسم کی ”شرعی رسوم“ نافذ العمل ہو، خواہ اس کی تفصیل اشکال کچھ ہی ہوں۔ جن تقریبات کو آجکل ”شرعی تقریبات“ کہا جاتا ہے وہ بھی بس صرف اس حد تک ”شرعی“ ہوتی ہیں کہ ان میں ناچ، ہارسہ گاہ اور ایسی ہی دوسری خرافات و مخرافات نہیں ہوتی، لیکن مذکورہ بالا رسوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان میں بھی بدرجہ اتم موجود رہتی ہیں اور انہیں ”اباحت“ کی چادر میں چھپایا جاتا ہے۔ پس کیا جماعت اسلامی کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے اراکین کو غیر شرعی رسوم کی وضاحت اس طرح کر کے بتائے کہ یہ ”اباحت“ کی قبا چاک ہو جائے اور وہ اپنی تقریبات کو بالکل منون طریقہ پر منائیں۔

اگر ان رسوم کے خلاف میرا احساس صحیح نہ ہو تو پھر کچھ وضاحت سے ”شرعی رسوم“ کے واجبات کو قابل بغاوت قوانین باطل سے مستثنیٰ قرار دینے کی وجہ تحریر فرمائیں۔ اس سے اگر میرا اطمینان ہو

گیا تو تجربہ کی مصیبت سے نجات حاصل ہو سکے گی اور اگر آپ نے میری رائے کی تصدیق کی تو پھر میرے لیے بظاہر کامیابی کا کہیں موقع نہیں ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی مسرت ہوگی، کیونکہ پھر تکلیف صحیح معنوں میں اللہ کی راہ میں ہوگی۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

جواب :-

ہم ”الاقدم فالاقدم“ کے اصول پر کام کر رہے ہیں۔ پہلے دین کی جڑوں کو رلوں میں جمانا ضروری ہے، اس کے بعد تفصیلات کو ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ زندگی کے مختلف گوشوں اور کونوں میں درست کرنے کا موقع آئے گا۔ اگر ہم شادی بیاہ، لین دین اور دوسرے معاملات کی تفصیلات و جزئیات بیان کرنے پر اتر آئیں تو جاری اصول دعوت کا کام منتشر ہو جائے گا۔ اس لیے جہاں تک دین کے بنیادی امور کا تعلق ہے ہم ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے ان کے متعلق ہم سرورست اجمال سے کام لے رہے ہیں۔

شادی بیاہ وغیرہ تقریبات کی رسوم کی پوری پوری اصلاح اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ دینی زندگی اپنی صحیح بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہوئی اس مرحلہ پر پہنچ جائے، جہاں ان چیزوں کی اصلاح ممکن ہو۔ اس وقت تک ہمارے ارکان کو زیادہ تر صرف ان چیزوں سے اجتناب پر اصرار کرنا چاہیے جن کو عرفی و شرعی اعتبار سے ناجائز سمجھا جاتا ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو معاشرت اسلامی کی روح کے خلاف ہیں مگر مسلمانوں کی موجودہ معاشرت میں قانون و شریعت بنی ہوئی ہیں تو وہ

ہمارے ذوقِ اسلامی پر خواہ کتنی ہی گراں ہو، لیکن سرِ درست نہیں ان کو اس امید پر گوارا کر لینا چاہیے کہ بتدریج ان کی اصلاح ہو سکے گی۔ مگر یہ گوارا اگر نارضا مندی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ احتجاجِ اہل فہائش کے ساتھ ہو۔ یعنی ہر ایسے موقع پر واضح کر دیا جائے کہ شریعت تو اس طرح کے نکاح چاہتی ہے جیسے ازدواجِ مطہرات اور دوسرے صحابہ کے ہوئے تھے، لیکن اگر تم لوگ یہ تکلفات کیے بغیر نہیں مانتے تو مجبوراً ہم اس کو گوارا کرتے ہیں اور خطائے دعا کرتے ہیں کہ وہ وقت آئے جب تم نبی اور اصحابِ نبیؐ کی طرح سادہ نکاح کرنے کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھو!

ہمارے رویہ تو عام لوگوں کے لیے ہے جن سے ہم مختلف قسم کے روابط پیدا کرنے اور جن کے ساتھ کئی طرح کے دنیوی امور میں معاملہ کر کے پرہیزوار ہیں۔

لیکن خود ارکانِ جماعت کے درمیان ایسے جتنے روابط اور معاملات بھی ہوں، انہیں رسوم کی آلودگیوں سے پاک کر کے سادگی کی اس سطح پر لے آنا چاہیے جس تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے انہیں پہنچایا تھا۔ ہمارے معاملات میں مباحات کو مباحات ہی کی حد تک رہنا چاہیے۔ رواج کی رد میں بہنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو بغاوت کرنا بھی چاہتے ہیں مگر چل کی جہالت نہیں کر سکتے۔ رسول کی بیٹیوں سے نجات حاصل تو کرنا چاہتے ہیں مگر دوسروں سے پہلے انہیں کاٹنے کی جرات نہیں رکھتے۔ اپنی بیٹیوں پر لدے ہوئے رواجوں کے بوجھوں سے ان کی کمر ٹوٹ رہی ہوتی ہیں مگر ان کو پٹخ دینے میں پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ پہل اور پیش قدمی اب ہم لوگوں کو کرنی ہے۔ ہمارے ہر ساتھی کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے روزمرہ کے معاملات اور تقریبات کو گونا گوں پابندیوں سے آزاد

کرنے میں پوری بے باکی سے پہل کرے۔ اہل فوگوں کی "ناک" بچانے کے خود نکو بن کر معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرے۔ خالص اسلامی انداز میں تقریبات اور معاملات کو سرانجام دینے کی مثالیں اگر جگہ جگہ ایک دفعہ قائم کر دی جائیں گی تو سوسائٹی کا کچھ نہ کچھ عنصر ان کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور اس طرح رفتہ رفتہ احوال بدل سکیں گے۔

### سوال ۱۔

ہمارے علاقے میں عام طور پر نکاح کا مہر نو صد روپیہ معین ہوتا ہے۔ اس سے تین سو روپیہ کی ادائیگی ہو جاتی ہے اور چھ سو روپیہ کی رقم وصول طلب رہتی ہے۔ لیکن بالعموم مرد کی طرف سے اس چھ سو کی ادائیگی کی توجہ کبھی نہیں آتی۔

ہمارے ایک رشتہ دار کی لڑکی کا نکاح آج سے تقریباً ۵ سال قبل ہوا تھا اور اس کا مہر دس ہزار روپیہ قرار پایا تھا۔ لڑکے کی طرف سے اول اول اتنے بٹے مہر کو تسلیم کرنے میں پس و پیش ہوتا رہا مگر آخر کار مرض اس وجہ سے یہ بٹے چھوڑ دی گئی کہ یہ سب کچھ ایک نمائشی رقم کے ہوا کچھ نہیں۔

اب اسی رشتہ دار کی دوسری لڑکی کی نسبت میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ ملے پائی ہے اور اب جلد ہی اس کا نکاح ہونے والا ہے۔ لڑکے کے اولیاء کی طرف سے قبل از وقت یہ اطلاع پہنچادی گئی ہے کہ مہر وہی نو دس ہزار روپیہ مقرر ہوگا۔ اگر اس رقم میں اب کوئی کمی کی جائے تو ان کا پہلا دانا

بگڑ جائے گا کہ جب اس کے لیے دس ہزار روپیہ رکھا گیا تھا تو اب دوسرے داماد سے کوئی امتیازی رویہ کیوں اختیار کیا جائے ؟

اس الجھن کو طرفین نے حل کرنے کی صورت یہ سوچی ہے کہ مجلس نکاح میں جب کہ ہمارے عزیز کا پہلا داماد موجود ہوگا ، مہر دہی نو دس ہزار روپیہ تحریر کیا جائے گا ، مگر بعد میں خفیہ طوع پر اس تحریر کو بدل کر نو ہزار سے نو سو کر دیا جائے گا ۔ اس طرح پہلا داماد ناراض ہو گا نہ ہمارے چھوٹے بھائی پر بار ہے گا ۔

مجھے اس مجتذہ صورت معاملہ میں کشک می ہو رہی ہے اہل میں نے اس کا اظہار اپنے والد محترم کے سامنے بھی کر دیا ہے اہل سے درخواست کی ہے کہ وہ ملائے شریعت سے مقصود کر لیں ۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ ایک مقامی مفتی صاحب سے استفتاء کیا جا چکا ہے اہل ان کی رائے میں ایک معاملہ میں طرفین جب راضی ہیں تو شریعت معترض نہیں ہو سکتی ۔ اس پر میں نے والد صاحب پر اپنا عدم الطینان ظاہر کیا ہے ۔

یہی معاملہ جامعہ اسلامی کے ایک رکن کے سامنے رکھا تو انہوں نے فرمایا کہ مجتذہ صحت معاملہ میں ایک تو پہلے داماد کو فریب دیا جائے گا اہل دوسرے دس ہزار مہر کی ہر حال ایک اہل شمال عوام کے سامنے قائم کی جائے گی اہل ہم درواج کی بیٹیوں میں گویا ایک کڑی کا اضافہ کیا جائے گا ۔ اس وجہ سے میں اسے صحیح نہیں سمجھتا ۔

اب مشکل ہے کہ نکاح کی مجلس میں بڑے کا بھائی ہونے کی وجہ

سے مجھے شریک بھی ہونا ہے اللہ شاید وکیل یا گواہ بھی بننا چاہے ، اللہ صورت ایسی ہے کہ میرا ضمیر اس کے ہائے ہونے کی شہادت نہیں دیتا ۔ اگر میں بحقیقت وکیل یا شاہد مجلس میں شریک ہوتا ہوں تو از خود اس غلطی میں حصہ دار ہوں جس کو سوچ مجھ کو میرے اعزہ کر سکتے ہیں ۔ اگر شرکت سے باز رہوں تو بکھا جائے گا کہ میں بھائی کی شادی پر خوش نہیں ہوں ۔ نیز اگر عدم شرکت کا وجہ مجھے بوجھ جائے تو میں خاموش رہنے پر مجبور ہوں ، کیونکہ اگر حقیقت بیان کر دوں تو سارا معاملہ مدیم برہم ہو سکے گا ۔

اب براؤ کریم آپ میرے لیے صحیح اسلامی مدتیہ تجویز فرمادیں اللہ اللہ میں دنیوی تعلقات اللہ مفاد کو تسلیل میں عاجز نہ ہونے دے گا ۔ میں مرث شریعت کا حکم معلوم کرنا چاہتا ہوں اللہ اس کے اتمام پر تیار ہوں ذرا کے لیے کوئی تاخیر مجھے مطلوب نہیں ہے ۔

جواب :-

جو معاملہ آپ نے کھلے دہ ایک نمونہ ہے ان غلط کاریوں کا جن میں مسلمان شریعت و اخلاق سے دور ہو کر مبتلا ہو گئے ہیں ۔ شریعت نے مہر کو عودت کا ایک حق مقرر کیا ہے اور اس کے لیے یہ طریقہ طے کیا تھا کہ عودت اور مرد کے درمیان جتنی رقم طے ہو اس کا ادا کرنا مرد پر واجب ہے ۔ لیکن مسلمانوں نے شریعت کے اس طریقہ کو بدل کر مہر کو ایک رسمی ادھ دھارے کی چیز بنا لیا ۔ اللہ بڑے بڑے مہر دھارے کے لیے ہاندھے شروع کیے ، جن کے



ادا کرنے کی ابتداء ہی سے نیت نہیں ہوتی اور جو خاندانی نزاع کی صورت میں عورت اور مرد دونوں کے لیے بائے ہاں بن جاتے ہیں۔ اب ان غلطیوں سے بچنے کی سیدھی اور صاف صورت یہ ہے کہ مہرا تھے ہی باندھے جائیں جن کے ادا کرنے کی نیت ہو، جن کے ادا کرنے پر شوہر قاعد ہو۔ پورا مہر بردقت ادا کر دیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ اس کے لیے ایک مدت کی قرارداد ہونی چاہیے اور آسان قسطوں میں اس کو ادا کر دینا چاہیے۔ اس راستی کے طریقہ کو چھوڑ کر اگر کسی قسم کے چیلے نکالے جائیں گے تو نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ ایک غلطی سے بچنے کے لیے دس قسم کی اور غلطیاں کی جائیں گی جو شرع کی نگاہ میں بہت بُری اور اخلاق کے اعتبار سے نہایت بد نما ہیں۔ آپ ایسے نکاح میں دکیل یا گواہ کی حیثیت قبول نہ کریں، بلکہ فریقین کو سمجھانے کی کوشش کریں اور اگر نہ مانیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ نکاح میں شریک ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جھوٹ اور فریب کا گواہ بننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔

(ترجمان القرآن، ذی القعدہ ۱۳۶۵ھ۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء)

## آلات کے ذریعہ سے توالد و تناسل

سوال :-

کیا دی آلات کے ذریعہ سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو، تو یہ عمل مغفرت سے

خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں؟ اور اس عمل کی معمولہ زانیہ  
 شمار کی جائے گی، اور اس پر خدِ جاری ہوگی یا نہیں؟ اس امر کا خیال  
 رکھیے کہ آج کل کی فلیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے  
 وہ اگر سائنٹفک طریقوں سے اپنے حقہ کا نسل بڑھانے کا فریضہ  
 ادا کر دے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ امریکہ  
 میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو اردو سے قانون جائز اولاد تسلیم  
 کیا گیا ہے۔“

جواب :-

آلات کے ذریعہ سے استقرارِ حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لیے اس  
 عمل کا تصور ہی ناقابلِ برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک بگڑ  
 دی جائے۔ آخر انسان کی صنعتِ اثاث اور حیوانات کی مادہ میں تو فرق  
 رہنے دیجئے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل کا جو طریقہ مقرر  
 کیا ہے وہ نہ اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہی ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے  
 کہ وہ گھوڑیوں کو اپنے زروں سے ملنے کا لطف حاصل نہیں کرنے دیتا اور  
 ان سے صرف نسل کشی کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان کی اپنی مادہ کے ساتھ  
 بھی یہی برتاؤ شروع ہو جائے تو اس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے  
 ہیں۔

آج کی ”فلیشن دار“ عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل  
 اس کی فطرت کو مصنوعی فکری و صنعتی ماحول نے مسخ کر دیا ہے۔ ورنہ اگر وہ

صحیح انسانی فطرت پر ہوتی تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو دلدار  
ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے بلکہ  
عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی قدرتی بنیاد ہے۔ فطرت الہی نے عورت  
اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان میں ملازمت اور رحمت ہو، حسن معاشرت  
ہو، مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی نشوونما حاصل  
کرے۔ اس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا  
فَلْيَقْصِرَتْ خُلُقُ اللَّهِ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا  
مصدق ہے جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا  
ہے لہذا وہی اولاد جائزہ اولاد ہے جو قید نکاح میں پیدا ہو۔ اسی سے ولادت  
اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے۔ اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو  
اُسے حلالی نہیں کہا جاسکتا۔ شرعی نقطہ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔  
نیز اس کا سلسلہ آبائی منقطع ہوگا اور وہ باپ کے درخت سے محروم رہے گا  
جو قطعی طور پر اس کی حق قفسی ہے۔

پھر غور تو کیجئے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار  
کون ہوگا؟ صرف ماں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچے کے لیے  
ماں اور باپ، چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صحبت میں جو ربّی  
پیدا کیے ہیں ان میں سے آدمے ساقط کر دیئے جائیں اور وہ صرف سلسلہ  
مادی پر منحصر رہ جائیں؟ کیا دنیائے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور

پدرانہ اخلاق کو فنا کر دنیا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری قائل رہے مگر ہمیشہ کے لیے باپ ہونے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے؟

پھر اگر یہی سلسلہ چلے پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے "امتحانی ٹیوں" میں پالا جائے۔ یعنی انسان کی پیدائش عمل میں پیدا ہونے لگے۔ اور جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی، عورت چاہے گی کہ اسے بچہ جننے کی تکلیف دی جائے، اس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے وہ تیار نہ ہوگی۔ یہ صورت جب رونما ہوگی تو انسانی بچے اسی طرح "کثیر پیداواری"

کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موڈے نکلتے ہیں۔ یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اس کا اسفل السافین ہوگا۔ ان "کارخانہ ہائے نسل کشی" سے انسان نہیں بلکہ مدٹے جانور پیدا ہوں گے، جن میں انسانی شرف اور پاکیزہ انسانی جذبات و احساسات کی خوب بڑے نام بھی نہ ہوگی اور سیرت کا وہ متوج نہ پیدا ہوگا جو تمدن کی رنگارنگ حرکیات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ میرے خیال میں تو وہ مادہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجوئیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں۔ اس قسم کی تجویدوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے

کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت لپٹ اور ذلیل کر دیا ہے۔

(ترجمان القرآن - محرم ۱۳۶۳ھ - جنوری، فروری ۱۳۶۴ھ)

## اسلام اور آلاتِ موسیقی

سوال :-

- (۱) کیا آلاتِ موسیقی بنانا انسان کی تجارت کرنا جائز ہے؟
- (۲) کیا شادی بیاہ کے موقع پر باجے وغیرہ بجانا جائز ہیں؟ نیز تفریحاً ان کا استعمال کیسا ہے؟
- (۳) اگر جواب نفی میں ہے تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود ان کا استعمال نہیں کرتے لیکن ایسے تعلق داروں کے ہاں بخوبی کشیدگی چلے جاتے ہیں۔ جو آلاتِ موسیقی کا استعمال کرتے ہیں؟
- (۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونے کی اجازت ہے جہاں آلاتِ موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو؟
- (۵) آلاتِ لہو کے حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں دف ہی ایک موسیقی کا آلہ عرب میں رائج تھا، اور آپؐ نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، لہذا ہمارے زمانے میں دف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں متعلیٰ ہو گئی ہیں تو ان کا استعمال کیوں نہ روا

ہو ؟

(۶) کیا دف آلاتِ لہو میں شامل ہے ؟

جواب :-

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ” میں آلاتِ موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں “ اب یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو بنی اس کام کے لیے بھیجا گیا ہو اس کے پیروانہی آفات کو بنانے اور بچنے اور بچانے کے لیے اپنی قوتیں استعمال کریں ۔

(۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور باجے بکنا کسی حال میں درست نہیں ۔ حدیث میں جس حد تک اجازت پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شادی اور عید کے موقع پر دف کے ساتھ کچھ گایا جائے ۔

(۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے کہ آدمی اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ناکار سے ڈر کر ایک ناجائز کام میں حصہ لے ۔ رسولؐ اور صحابہؓ رسولؐ کے ساتھ جو لوگ جو اپنا حشر چاہتے ہوں اُن کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے رابطہ ضبط نہ رکھیں جنہیں احکامِ شریعت کی پروا نہیں ۔ در نہ جن کو ان لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں ، انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جاسکتا ۔ جب تمہاری دنیا فاجروں کے ساتھ ہے ۔ تو آخرت میں بھی انہیں کا ساتھ نصیب ہوگا ۔

(۴) جوابٌ ملاحظہ ہو ۔ مگر یہ خیال رہے کہ مجلسِ نواح میں جبکہ ایک باب و قبول ہو رہا ہو اور منکرات و فواحش کی نمائش نہ ہو رہی ہو شرکت کرنے میں مضائقہ

نہیں، بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت ترمی اور شرافت کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمہارے جائزہ کاموں کا تعلق ہے ہم تمہاری مسرت میں دل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائزہ کاموں کا تعلق ہے ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم ان خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دف کے سوا اس زمانہ میں اور کوئی اور سرا آواز موسیقی نہ تھا۔ ایران اور روم اور مصر کی تمدنی تاریخ اور خود عرب جاہلیت کی تمدنی تاریخ سے جو شخص جاہل محض ہو وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعار جاہلیت میں ملتے ہیں۔

(۶) دف کا نام اگر آلات موسیقی میں شامل ہو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور عید کے موقع پر بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک آدی جاسکتا ہے۔ اس آخری حد کو جو شخص نقطہ آغاز بنانا چاہتا ہو اس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ مخواہ اس بنی کے پیروں میں اپنا نام بکھوائے جو آلات موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے؟

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۱۳۶۳ھ - جنوری، فروری ۱۹۴۲ء)

## گڑیوں کا حکم

سوال :-

کیا بچوں کے کھیل کا سامان، مثلاً چینی کی گولیاں، تاش، بٹک کی چڑیا اور لٹکیل کے بے ٹڑیاں وغیرہ فروخت کرنا جائز ہے، نیز ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں بھی بیچی جاسکتی ہیں ؟

جواب :-

بچوں کے کھلونے جیسا کہ بگائے خود نا جائز نہیں ہے الا یہ کہ کسی خاص کھلونے یا کھیل کے سامان میں کوئی شرعی قباحت ہو۔ رہے جانوروں اور آدمیوں کے مجسمے تو ان کی مدصورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پوری باریکی سے تمام خدو خال کے ساتھ انہیں بنایا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ محض ایک سرسری سا ڈھانچہ کسی جائدار کا ہو جیسے مٹھی کے گھوڑے اور کپڑے کی گڑیاں۔ پہلی قسم کے مجسموں کی فروخت جائز نہیں ہے۔ البتہ دوسری قسم کے کھلونے آپ بیچ سکتے ہیں۔ رہیں ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں تو اگر وہ مشرک اور خبیثات کی نمائندہ ہوں، مثلاً کہشن جی کی مورتی یا رام چندر جی کا مجسمہ وغیرہ، تو ان کی فروخت حرام ہے۔

## اشتہاری تصویریں

سوال :- اشتہار کے لیے کینڈر وغیرہ آج کل عورتوں کی تصاویر



بنانے کا بہت رواج ہے، نیز بعض مشہور شخصیتوں اور قومی رہبروں کی تصاویر بھی استعمال کی جاتی ہیں، علاوہ بریں تجارتی اشیاء کے ڈبوں اور بوتلوں اور لٹافوں پر چھاپی جاتی ہیں۔ ان مختلف صورتوں سے ایک مسلمان تاجر اپنا دامن کیسے بچا سکتا ہے ؟

جواب :-

اگر کوئی اشتہار یا کیلنڈر خود آپ چھپوائیں تو اسے تصویر سے پاک رکھیں۔ اور ضرورتاً اگر آپ کو اپنی ذات کے لیے کیلنڈر اور وغیرہ کا استعمال کرنا پڑے تو اول تو بے تصویر لیجئے، ورنہ تصاویر کو چھپا دیجئے۔ لیکن ڈبوں اور بوتلوں اور لٹافوں پر آپ کہاں تک تصاویر کو مٹا سکتے ہیں۔ موجودہ تصویر پرست دنیا نے قسم کھالی ہے کہ کسی چیز کو تصویر سے خالی نہ چھوڑے گی۔ ڈاک کے ٹکٹوں اور سکوں تک پر تصاویر موجود ہیں۔ یہ ہمہ گیر نظام طاغوت اپنی ناپاکیوں اور غلامتوں کو جڑ سے لے کر شاخوں اور پتوں تک پھیلایا چلا جا رہا ہے۔ بس اپنی حد امکان تک اپنا دامن بچائیے اور اس حد سے آگے جو کچھ ہے اس سے اپنے آپ کو اور دنیا کو بچانے کے لیے یہ سعی کیجئے کہ نظام باطل کا تسلط ختم ہو اور نظام حق کا اقتدار جے۔ اس کی جڑ کٹے گی تو شاخیں آپ ہی جھڑ جائیں گی۔

کنیز کی تعریف اور اس کے حلال ہونے کا حکم

سوال ۱۔ قرآن نے کنیز کی کیا تعریف بیان کی ہے ؟ اور کنیز کے

بلا نکاح حلال ہونے کی دلیل کیا ہے ؟

جواب :-

قرآن میں کنیز کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ”وہ عورت جو زور بازو سے حاصل ہو“ اور چونکہ قرآن زور بازو کے استعمال کو صرف قتال فی سبیل اللہ تک محدود رکھتا ہے اس لیے قرآن کی تعریف کی رو سے کنیز صرف وہ عورت ہے جو راہِ خدا میں جنگ میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

یہ تعریف اور ایسی عورت کے حلال ہونے کی دلیل اس آیت میں ہم کو ملتی ہے : حُبِّمَتْ عَلَيْكَ أُمَّهَاتُكُمْ ..... وَالْأَخْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (حرام کی گئیں تمہارے لیے تمہاری مائیں ..... اور وہ عورتیں جو شادی شدہ ہوں ماسوائے ان عورتوں کے جن کے مالک ہوئے تمہارے سیدھے ہاتھ)۔ سیدھا ہاتھ عربی میں قدرت،

غلبہ و قہر اور زور بازو کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ یہ بجائے خود کنیز کی مذکورہ بالا تعریف کے حق میں کافی دلیل ہے، اس پر مزید دلیل یہ ہے کہ وہ شادی شدہ

عورت جس کو اس آیت میں حرمت کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، بہر حال وہ عورت تو نہیں ہو سکتی جس کا نکاح دارالاسلام میں ہوا ہو، کیونکہ آیت کا سیاق خود بتا رہا ہے کہ وہ اُن محصنات میں شامل ہے جو حرمتِ علیکم کے تحت آتی ہیں اس لیے لائحہ عملہ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ سے مراد وہی شادی شدہ عورتیں ہوں گی جن کے نکاح دار الحرب میں ہوئے ہوں اور پھر وہ جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔

رہی اُن کے بلا نکاح حلال ہونے کی دلیل، تو وہ یہ ہے کہ اول تو مذکورہ بالا آیت میں جن شادی شدہ عورتوں کو حرام کیا گیا ہے اُن سے وہ عورتیں مستثنیٰ کر دی گئی ہیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئی ہوں۔ پھر اس نے بعد فرمایا :

وَأَحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُعْهِنِينَ غَيْرِ مُسَافِحِينَ (اور حلال کیا گیا تمہارے لیے ان کے سوا دوسری عورتوں کو اس طور پر کہ تم ان کو اپنے اموال کے بدلے حاصل کرو قیدِ نکاح میں لانے والے بن کر، نہ کہ آزاد شہوت رانی کرتے ہوئے)۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ملکِ یمن میں آئی ہوئی عورتوں کو مہر دے کر نکاح میں لانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس کے بغیر ہی حلال ہیں۔

اس معنی پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے :

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ..... وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ أَلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝

(فلاح پائی ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع برتتے ہیں ..... اور جو اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں سوائے اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں سے محفوظ نہ رکھنے پر وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں)۔

اس آیت میں اہل ایمان کے لیے مذکور کی عورتوں سے تعلقِ شہوانی کو

جائز ٹھیرایا گیا ہے۔ ایک ان کی ازدواج۔ اور دوسرے مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ  
ازدواج سے مراد تو ظاہر ہے کہ منکوحہ بیویاں ہیں، اب اگر مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ  
بھی منکوحہ بیویاں ہی ہوں تو ان کا ازدواج سے الگ ذکر سراسر فضول ٹھیرتا  
ہے۔ لہذا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن سے محض بلک بیہن کی بنا پر تمتع  
جائز ہے۔

(ترجمان القرآن۔ سوال ۱۳۴۵ء۔ جون ۱۹۵۶ء)

## تعددِ ازدواج اور لونڈیاں

سوال ۱۔

حسب ذیل آیت کی تفہیم کے لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں  
وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا  
كَلَمَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنًا وَثُلَاثًا وَرُبْعًا  
فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ  
دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس آیت میں چار بیویاں کرنے کی  
اجازت صرف اُس شخص کو ہے جو یم لڑکیوں کا دلی ہو اور اس امر کا  
اندیشہ ہو کہ وہ ان لڑکیوں کے متعلق انصاف نہ کر سکے گا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ بیویوں کے متعلق توقعِ عدل کی قید ہے کہ  
زیادہ سے زیادہ چار بیویاں کی جاسکتی ہیں۔ لیکن لونڈیوں کے ساتھ

تعلقات زن و شوئی قائم کرنے کے بارے میں ان کی تعداد کے متعلق کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ جنگ کے زمانے میں جو عورتیں پٹری پہلی آئیں گی اُن کی تعداد کا تعین نہیں کیا جاسکتا، اس لیے لونڈیوں سے تمتع حاصل کرنے کے متعلق بھی تعداد کا تعین نہیں کیا گیا، تو میں یہ عرض کر رہا ہوں گا کہ بے شک یہ صیح ہے اور اس لحاظ سے یہ تعین بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ایک سالانہ کے حصہ میں کتنی لونڈیاں آئیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے حصہ میں دس آئیں اور دوسرے کے حصہ میں بیس۔ لیکن جہاں تک ان لونڈیوں سے تمتع کا تعلق ہے اس کا تعین تو ہر حال ہو سکتا تھا کہ ایک شخص کے پاس لونڈیاں چاہے کتنی ہی ہوں وہ ان میں سے صرف ایک یا دو سے تمتع کر سکتا ہے، جیسا کہ بیویوں کی صورت میں تحدید ہے۔

اس آزادی کے ہوتے ہوئے ایک شخص نہ صرف یہ کہ مال غنیمت میں حصہ کے طور پر بہت سی لونڈیاں حاصل کر سکتا ہے، بلکہ وہ ان کی جتنی تعداد چاہے خرید بھی سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک نفس پرست سرمایہ دار کے لیے کھلا ہوا موقع ہے کہ وہ جتنی لونڈیاں چاہے خریدے اور ہوس رانی کرتا ہے۔ لونڈیوں سے بلا تعین تعداد تمتع کرنے کی کُل پوری اور عام اجازت دینے کی وجہ سے معاشرہ کے اندر وہی خرابی داخل ہو جاتی ہے جس کو اسلام نے زنا کہہ کر سخت سزا کا مستوجب

قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں یہی سبب تھا کہ جوں جوں مسلمانوں کی  
 سلفیں وسیع ہوئیں اور ان کی دولت میں اضافہ ہوا، مسلم سوسائٹی میں  
 رجم کی سزا کے جاری ہونے کے باوجود ہوس رانی بڑھتی گئی۔ کوئی  
 قانون ایسا نہ تھا جو اس طرالی کا انسداد کرتا۔ اسی ہی وجہ سے کہ ہم غلط  
 بنو اُمیہ اور عباسیہ کے عہد میں لونڈیوں کے غول کے غول پھرتے دیکھتے  
 ہیں اور پھر تاریخ میں اُن ذلیل سازشوں کا حال پڑھتے ہیں جو لونڈی  
 غلاموں کے خدے لیے پروان چڑھتی تھیں۔ پس میری رائے یہ ہے کہ اگر  
 لونڈیوں سے تمتع کرنے کی اجازت بھی بہ تعین تعدد ہوتی تو مسلم معاشرہ  
 میں وہ مفسد اور نفس پرستیاں نہ پیدا ہوتیں جن کی طرف ادھر اشارہ  
 کیا گیا ہے۔ بہر حال ارشاد فرمائیے کہ شارع نے کن وجوہ دمعلم کی  
 بنا پر لونڈیوں سے تمتع کی اجازت دیتے ہوئے تعدد کا تعین نہیں  
 کیا ؟

اسی ضمن میں ایک غیر اصول یہ بھی ہے کہ اگر لونڈی مشترکہ ہو تو کیا  
 اس کے ساتھ تمتع جائز ہے ؟

جواب :-

آیت وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَقْسُطُوْا فِی الْیَمٰنِیْ پُر تفصیل کے ساتھ

۱۔ اس طرح کے سوالات اور ان کے جوابات سے لوگ ہمارا وقت یہ بچنے لگتے  
 ہیں کہ شاید یہ مسائل حال یا مستقبل کے لیے زیر بحث آ رہے ہیں۔ حالانکہ دراصل ان

تفہیم القرآن میں نوٹ لکھ چکا ہوں۔ اس کے اعادے کی حاجت نہیں۔ آپ اسے ملاحظہ فرمائیں۔ جہاں تک خدا اس آیت کی تفسیر کا تعلق ہے، اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، اہل صحابہ و تابعین سے منقول ہیں۔ مثلاً ایک معنی یہ بھی ہیں

سوالات کا تعلق اُس دور کے حالات سے ہے جب کہ دنیا میں اسیرانِ جنگ کے تبادلہ کا طریقہ رائج نہ ہوا تھا اور فدے پر کھڑے کرنا بھی دشمن مملکتوں کے لیے مشکل ہوتا تھا۔ آج ان مسائل پر بحث کرنے کی غرض یہ نہیں ہے کہ ہم اب لوشہ یلوں کی تجارت کا بازار کھولنا چاہتے ہیں بلکہ اس کی غرض یہ بتانا ہے کہ جس دور میں اسیرانِ جنگ کا تبادلہ اور فدے کا معاملہ ملے نہ ہو سکتا تھا اس زمانہ میں اسلام نے اس پیچیدہ مسئلہ کو کس طرح حل کیا تھا۔ نیز اس کی غرض ان اعتراضات کو رفع کرنا ہے جو نادانوں کی طرف سے اسلام کے اس حل پر کیے جاتے ہیں۔ ہم نے جب کبھی اس مسئلے سے بحث کی ہے اسی غرض کے لیے کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فتنہ پرداز لوگ جان بوجھ کر اسے، معنی پہناتے ہیں کہ ہم آج اس زمانہ میں بھی غلامی ہی کے طریقے کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، خواہ اسیرانِ جنگ کا تبادلہ اور فدے ممکن ہو یا نہ ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اس قسم کی باتیں کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کہتے ہیں، اور ہم ان سے اتنی حیا داری کی توقع بھی نہیں کرتے کہ وہ ہماری اس تصریح کے بعد اپنی الزام تراشیدوں سے باز آجائیں گے۔ تاہم یہ تصریح صرف اس لیے کی جا رہی ہے کہ جو لوگ ان کی باتوں سے کسی غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

کہ اگر تم قیدیوں کے ساتھ یوں انصاف نہیں کر سکتے تو ایسی عورتوں سے نکاح کر  
 لو جن کے شوہر مر چکے ہیں اور چھوٹے چھوٹے نیم بچے چھوڑ کر گئے ہیں۔  
 یہ معنی اس لحاظ سے زیادہ سمجھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ یہ سداۓ جنگِ احد  
 کے بعد نازل ہوئی تھی اور اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے تھے  
 لیکن یہ بات کہ اسلام میں چار ہجریوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے، اور  
 یہ کہ بیک وقت چار سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، اور یہ کہ اس فرمان  
 کا کوئی تعلق تیمانی کے معاملہ سے نہیں ہے، محض اس آیت سے نہیں نکلتی  
 بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس قولی دلیل و عقل و شریع سے معلوم ہوتی ہے جو آپؐ نے  
 اس آیت کے نزول کے بعد فرمائی تھی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے  
 اپنی لوگوں کو جن کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں تھیں حکم دے دیا  
 کہ وہ صرف چار رکھ لیں اور اس سے زائد جس قدر بھگہول انہیں چھوڑ دیں۔  
 حالانکہ ان کے ہاں تیمانی کا کوئی معاملہ مد پیش نہ تھا۔ نیز آپؐ کے عہد میں  
 بکثرت صحابہ نے چار کی حد کے اندر متعدد نکاح کیے اور آپؐ نے کسی سے  
 یہ نہ فرمایا کہ تمہارے لیے قییم بچوں کی پرورش کا کوئی سوال نہیں ہے، اس لیے  
 تم اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر صحابہؓ سے  
 لے کر بعد کے اُردوار تک امت کے تمام فقہاء نے یہ سمجھا کہ یہ آیت نکاح  
 کے لیے بہ یک وقت چار کی حد مقرر کرتی ہے جس سے تباہ نہ جائز نہیں کیا  
 جاسکتا، اور یہ کہ چار کی اجازت عام ہے، اُس کے ساتھ یہ کوئی قید نہیں کہ  
 تیمانی کا کوئی معاملہ بھی درمیان میں ہو۔ خود حضورؐ نے متعدد نکاح کیے اور کسی



میں میموں کے مسئلے کا دخل نہ تھا۔

لونڈنیوں کے بارے میں آپ یہ جو تجویز پیش کرتے ہیں کہ ایک شخص کو لونڈیاں تو بلا قید تعداد اور رکھنے کی اجازت ہوتی مگر تمتع کے لیے ایک یا دو کی حد مقرر کر دی جاتی۔ اس میں آپ نے صرف ایک ہی پہلو پر نگاہ رکھی ہے، دوسرے پہلوؤں پر غور نہیں فرمایا۔ تمتع کے لیے جو حد بھی مقرر کی جاتی اس سے زیادہ بھی ہوئی عورتوں کے مسئلہ کا کیا حل تھا؟ کیا یہ کہ وہ مرد کی صحبت سے متعلق طور پر محرم کر دی جاتیں؟ یا یہ کہ انہیں گھر کے اندر اور اس کے باہر اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لیے ناجائز وسائل تلاش کرنے کی آزادی دے دی جاتی؟ یا یہ کہ ان کے نکاح لازماً دوسرے لوگوں سے کرنے پر ہالکوں کو از روئے قانون مجبور کیا جاتا اور قیدی عورتوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ڈالنے کے علاوہ ایک ذمہ داری ان پر یہ بھی ڈال دی جاتی کہ وہ ان کے لیے ایسے شوہر تلاش کرتے پھر یہ جو لونڈنیوں کو نکاح میں لینے پر راضی ہوں؟

آپ کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ لونڈی سے تمتع کے لیے شریعت میں یہ قید نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے ہو۔ اور یہ قید عقل کی رو سے بھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مصلحتیں آدمی سے زیادہ فوت ہو جاتیں جن کی بنا پر امیرانِ جنگ کو (تبادلہ نہ ہو سکے کی صورت میں) افراد کی ملکیت میں دینے کا طریقہ پسند کیا گیا تھا اور قیدی عورتوں سے ان کے ہالکوں کو تمتع کی اجازت دی گئی تھی۔ کیونکہ اس صورت میں صرف وہ عورتیں مسلم

سوسائٹی کے اندر جذب کی جاسکتی تھیں جو کسی اہل کتاب قوم میں سے گھر غار ہو کر آئی ہوں۔ غیر اہل کتاب سے جنگ پیش آنے کی صورت میں مسلمانوں کے لیے پھر یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا کہ ان میں سے جو عورتیں قید ہوں ان کو دارالاسلام کے لیے فتنہ بننے سے کیسے بچایا جائے۔

(ترجمان القرآن - سوال ۱۳۴۵ - جون ۱۹۵۶ء)

## تعددِ ازدواج پر پابندی

سوال ۱۔

میں آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر اسلامی ریاست میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہو تو کیا حکومت اس بنا پر تعددِ ازدواج پر پابندی عائد کر سکتی ہے؟

اس سوال کی ضرورت میں نے اس لیے محسوس کی ہے کہ میرا اندازہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں تعددِ ازدواج کی اجازت دی ہے وہاں منہنگامی صورت حال پیش نظر تھی۔ اس زمانے میں سالہا سال کے مسلسل جہاد کے بعد بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں اور بچے بے آسرا اور یتیم رہ گئے تھے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے یہ اجازت دی گئی تھی، تاکہ بیواؤں اور یتیم بچوں کو سوسائٹی میں جذب کیا جاسکے اور ان کی کفالت کی شائستہ صورت پیدا ہو سکے۔

جواب :-

آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں عورتوں کی تعداد کا مردوں سے اتنا کم ہونا کہ اس سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو جائے ایک شاذ و نادر واقعہ ہے۔ عموماً تعداد مردوں ہی کی کم ہوتی رہتی ہے۔ عورتوں کی تعداد کم ہونے کے منجھ وہ نہیں ہیں جو مردوں کی تعداد کم ہونے کے ہیں۔ عورتیں اگر کم ہوں گی تو اس وجہ سے کہ صنعتِ اناش کی پیدائش ہی منعیٰ ذکر سے کم ہو۔ اور ایسا ہونا اقل تو شاذ و نادر ہے۔ اور اگر ہو بھی تو عورتوں کی اتنی کم پیدائش نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے ایک معاشرتی مسئلہ پیدا ہو اور اسے حل کرنے کے لیے قوانین کی ضرورت پیش آئے۔ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی شادی کے رواج سے یہ مسئلہ خود ہی حل ہو جاتا ہے۔

دوسری بات جو آپ نے بھی ہے وہ قرآن کے صبیح مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کے کسی فرد میں بھی تعدد ازواج ممنوع نہ تھا، اور کوئی خاص وقت ایسا نہیں آیا کہ اس ممانعت کو کسی مصلحت کی بنا پر رفع کر کے یہ فعل جائز کیا گیا ہو۔ دراصل تعدد ازواج ہر زمانے میں تمام انبیاء و شریعتوں میں جائز رہا ہے اور عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں بھی یہ جائز اور رائج تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صحابہ کرام بھی اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر عامل تھے۔ قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو کہ اس آیت کے نزول سے پہلے تعدد ازواج ناجائز تھا اور اس آیت نے اگر اسے جائز کیا۔ آپ کے علم میں ایسی کوئی آیت نہ تو اس کا حوالہ دیں۔

سوال :-

آپ مجھے معاف فرمیں اگر میں یہ عرض کروں کہ آپ کے جواب سے تشفی نہیں ہوئی۔ میری گزارش صرف اتنی تھی کہ اگر کسی معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہو جائے تو کیا اس صورت میں حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی عائد کر سکے؟ آپ نے فرمایا ہے کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن میرا سوال بھی اسی شاذ و نادر حال سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس وقت پاکستان میں دردم شہری کی رُو سے (عورتیں مردوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ اب کیا حکومت کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے کہ جب تک یہ صورت حال قائم رہے، ایک سے زیادہ شادیوں کی ممانعت ہو جائے؟

میں نے عرض کیا تھا کہ تعدد ازواج کی اجازت کا مطلب غالباً یہ ہے کہ اس ترمانے میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوتِ حق میں معروض تھے، تو سالہا سال کے جہاد کی وجہ سے بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا مسئلہ حل کرنا پڑا، اور اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ ایک سے زیادہ شادی

کی اجازت دے دی جائے۔ جس مقام پر اجازت دی گئی ہے اس سے قبل جہاد قتالی کا ذکر آیا ہے۔ اس طرح میں نے غلط یا صحیح کی یہ استنباط کیا ہے کہ یہ اجازت مخصوص حالات کے لیے ہی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ استنباط غلط بھی ہے اور جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن کے صحیح مفسر پر مبنی نہیں تو اس سے ہٹ کر بھی یہی کچھ سوچا جاسکتا ہے کہ دود، تین تین اور چار چار نکاح اسی صحت میں کیے جاسکتے ہیں جبکہ معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ اگر ان کی تعداد مقابلہ زیادہ نہ ہو یا مردوں کے مساوی ہو تو اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے ؟

جواب ۱۔

پاکستان کی مردم شماری میں عورتوں کی تعداد کامردوں سے کم پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ فی الواقع ہمارے ہاں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم ہے۔ بلکہ اس میں ہمارے ہاں کے رسم و رواج کا بڑا دخل ہے جس کی بنا پر لوگ اپنے گھر کی عورتوں کا اندراج کرانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ تاہم اگر فرض کی آبادی میں چند لاکھ کافرق ہو بھی تو اس نے کوئی ایسا معاشرتی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا جس کے لیے تعدد ازواج پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ مسئلہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے نکاح ثانی سے حل ہو جاتا ہے اور بالفرض اگر کوئی بہت ہی غیر معمولی کسی واقع ہو جائے تو عارضی طور پر کچھ مدت کے

یہ پابندی عائد کرنا بھی جائز ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس پابندی کا اصل محرک یہی مسئلہ ہو۔ لیکن اس بات کو چھپانے کی آخر کیا ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں تعدد ازواج پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت دراصل اس بنا پر محسوس نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کا محرک یہ مغربی تخیل ہے کہ تعدد ازواج بجائے خدا ایک بنائی ہے اور اردو دئے قانون یک زوجی ہی کو رواج مطلوب ہے۔ یہ محرک ہمارے نزدیک سخت قابل اعتراض ہے اور اس کی جڑ کاٹنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

میں نے پہلے ہی لکھا تھا اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کوئی آیت تعدد ازواج کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی ہے۔ تعدد ازواج پہلے سے جائز چلا آ رہا تھا اور سورہ نساء کی آیت نمبر ۲ کے تفسیر سے پہلے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تین ازواج مطہرات موجود تھیں۔ نیز صحابہ کرام میں بھی بہت سے اصحاب تھے جن کے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں۔ سورہ نساء کی مذکورہ آیت اس جائزہ فعل کی اجازت دینے کے لیے نہیں آئی تھی بلکہ اس غرض کے لیے آئی تھی کہ جنگ اُحد میں بہت سے صحابہ کے شہید ہو جانے اور بہت سے بچوں کے یتیم ہو جانے سے فوری طور پر جو معاشرتی مسئلہ پیدا ہوا تھا اسے حل کرنے کی صورت مسلمانوں کو یہ بتائی گئی کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ دیے انصاف نہیں کر سکتے تو دو دو، تین تین چار چار عورتوں سے نکاح کر کے ان یتیموں کو اپنی سرپرستی میں لے لو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعدد ازواج صرف ایسے ہی مسائل پیش آنے کی صورت میں جائز ہے۔ آخر تیرہ چودہ سو برس سے ہمارے معاشرے میں یہ طریقہ رائج ہے۔ اس سے پہلے کب یہ سوال پیدا ہوا تھا

کہ تعدد ازواج کی اجازت مخصوص حالات کے ساتھ مشروط ہے ؟ یہ طرز فکر  
 تو ہمارے ہاں مغرب کے غلبے سے پیدا ہوا ہے ۔  
 (ترجمان القرآن - مئی ۱۹۶۳ء)

## توأم متحد الجسم لڑکیوں کا نکاح

ذیل میں جس سوال کا جواب درج کیا جا رہا ہے اس کی بنیاد پہ کئی  
 سال سے ایک گروہ مصنف کے خطوط پر پیدائشی گندہ کر رہا ہے کہ  
 اس نے جمع بین الاقنین کو حلال کر دیا ہے ۔ اب ہر شخص اسے  
 خود پڑھ کر رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس افزاء کی حقیقت کیا ہے ۔  
 یہ بھی واضح رہے کہ دو بھائیوں یا دو بہنوں کا متحد الجسم ہونا کوئی نیا نیا  
 واقعہ نہیں ہے ۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کے ریڈرز ڈائجسٹ میں سیام کے  
 متحد الجسم بھائیوں کا قصہ منظر فرمایا جائے )  
 سوالات :-

مندرجہ ذیل سطوح بغرض جواب ارسال ہیں ۔ کہ عاقبتی کے  
 در لیے بھیج کر نمونہ فرمائیں ۔

بہادرپور میں دو توأم لڑکیاں متحد الجسم ہیں ۔ یعنی جس وقت  
 وہ پیدا ہوئیں تو ان کے کندھے ، پیلو ، کولہے کی ہڈی تک آپس  
 میں جڑے ہوئے تھے ۔ انہ کی طرح سے ان کو جدا نہیں کیا جاسکتا

تھا۔ اپنی پیدائش سے اب جو ان ہوئے تک وہ ایک ساتھ چلتی پھرتی ہیں۔ ان کو بھوک ایک ہی وقت لگتی ہے۔ پیشاب پاخانہ کی حاجت ایک ہی وقت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو کوئی عارضہ لاحق ہو تو دوسری بھی اسی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان کا علاج ایک مرد سے ہو سکتا ہے یا نہیں۔ نیز اگر دونوں بیک وقت ایک مرد کے علاج میں آ سکتی ہیں تو اس کے لیے شرعی دلیل کیا ہے ؟

مقامی علماء نے ایک مرد سے علاج کی اجازت دیتے ہیں اور نہ دو سے۔ ایک مرد سے ان مدلول کا نکاح قرآن کی اس آیت کی رو سے درست نہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ دو حقیقی بہنیں بیک وقت ایک مرد کے علاج میں نہیں آ سکتیں۔ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ، اس حکم کو بنیاد بنا کر اگر دوسروں کے نکاح میں ان دو متحدہ الجسم عورتوں کو دسے دیا گیا تو مندرجہ ذیل دشواریاں ایسی ہیں جن کو ردیحہ کر علماء نے سکوت اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً :

۱۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایک مرد اپنی منکوحہ نامزد بیوی تک ہی اپنے صنفی تعلقات کو محدود کر سکے گا اور دوسری متحدہ الجسم عورت سے جو اس کے علاج میں نہیں ہے تعرض نہ کرے گا۔

۲۔ یہ دوسری عورت جو اپنی بہن سے متحدہ الجسم ہونے کے ساتھ متحدہ الزواج بھی ہے زوجی تعلق کے وقت متاثر نہ ہوگی۔

۳۔ دوسروں سے ایسا علاج جس میں دونوں عورتیں صنفی تعلقات



کے وقت، متاثر ہوتی ہیں، ان کی حیا مجروح ہوتی ہو، ان میں قبیاض  
جذبات پیدا ہوتے ہوں، کیا نکاح اس دوح کے منافی نہیں جس  
میں بتایا گیا ہے، و جعل بینکم مودة فی (الردم) و جعل  
منہا لیسکن الیہا (اعواف)

۴۔ نکاح کا ایک بڑا مقصد انزالِ نسل ہے والدین اور مولود  
میں شفقت بھی ہے۔ دوسروں کا یہ نکاح اس تعلق پر کھپاڑا چلاتا ہے۔  
اور بھی مفاسد ہیں جن کے بیان کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔  
براہِ کرم شریعت کی روشنی میں اس سوال کو حل کیجئے تاکہ یہ تذبذب  
دور ہو۔ ان عورتوں کے والدین ان کا نکاح کر سکیں۔ اور اس فتنہ کا  
سدِ باب ہو۔ جو جو ان ہونے کی وجہ سے ان کو لاحق ہے۔  
جواب ۱۔

ان دونوں لڑکیوں کے معاملے میں چار صورتیں ممکن ہیں،  
ایک یہ کہ دونوں کا نکاح دو الگ شخصوں سے ہو۔  
دوسری یہ کہ ان میں کسی ایک کا نکاح ایک شخص سے کیا جائے اور دوسری  
محروم رکھی جائے۔

تیسری یہ کہ دونوں کا نکاح ایک ہی شخص سے کر دیا جائے۔  
چوتھی یہ کہ دونوں ہمیشہ نکاح سے محروم رکھی جائے۔  
ان میں سے پہلی دو صورتیں تو ایسی مرتجہ ناجائز، غیر معقول اور ناقابلِ عمل ہیں  
کہ ان کے خلاف کسی استدلال کی حاجت نہیں۔ اب رہ جاتی ہیں آخری دو

صورتیں۔ یہ دونوں قابل عمل ہیں۔ مگر ایک صورت کے متعلق مقامی علماء کہتے ہیں کہ یہ چونکہ جمع بین الاختین کی صورت ہے چسے قرآن میں حرام قرار دیا گیا ہے، اس لیے لامحالہ آخری صورت پر ہی عمل کرنا ہوگا۔ لہذا ہر علماء کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ دونوں لڑکیاں تو ائمہ نہیں ہیں اور قرآن کا یہ حکم صاف اور صریح ہے کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں نکاح کرنا حرام ہے۔ لیکن اس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ان لڑکیوں کو دالمی تجربہ پر مجبور کیا جائے اور یہ ہمیشہ کے لیے نکاح سے محروم رہیں؟ اور کیا قرآن کا یہ حکم واقعی اس مخصوص اور نادر صورت حال کے لیے ہے جس میں یہ دونوں لڑکیاں پیدائشی طور پر مبتلا ہیں؟

میرا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس مخصوص حالت کے لیے نہیں ہے بلکہ اس عام حالت کے لیے ہے جس میں دو بہنوں کے الگ الگ مستقل وجود ہوتے ہیں، اور وہ ایک شخص کے جمع کرنے سے ہی بیک وقت ایک نکاح میں جمع ہو سکتی ہیں ورنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ عام حالات کے لیے حکم بیان کرتا ہے۔ اور مخصوص، شاذ اور نادر الوقوع یا عیسر الوقوع حالات کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح کے حالات سے اگر سالہ پیش آجائے تو نفقہ کا تعاضیہ ہے کہ عام حکم کو ان پر جو کاتوں چسپاں کرنے کے بجائے صورت حکم کو چھوڑ کر مقصد حکم کو مناسب طریقے سے پورا کیا جائے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ شارع نے روزے کے لیے یہ الفاظ صریح یہ حکم دیا ہے کہ طلوع فجر کے ساتھ اس کو شروع کیا جائے اور رات کا آغاز ہوتے ہی

افطار کر لیا جائے۔ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَسْبِقَ الْيَقِظُ  
 الْبَيْضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُوا الصُّلُوحَ  
 إِلَى النَّبْلِ یہ حکم زمین کے اُن علاقوں کے لیے جن میں رات کا اُلٹ پھیر  
 چوبیس گھنٹوں کے اندر پورا ہو جاتا ہے۔ اور حکم کو اس شکل میں بیان کرنے  
 کی وجہ یہ ہے کہ زمین کی آبادی کا بیشتر حصہ انہی علاقوں میں رہتا ہے۔ اب  
 ایک شخص سنت غلطی کرے گا اگر اس حکم کو اُن مخصوص حالات پر چوں کا مجوں  
 چپاں کر دے گا جو قطب شمالی کے قریب علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں  
 رات اور دن کا طول کئی کئی مہینوں تک متد ہو جاتا ہے۔ ایسے علاقوں کے  
 لیے یہ کہنا کہ وہاں بھی طلوع فجر کے ساتھ شروع کیا جائے امدادت آنے  
 پر کھولا جائے، یا یہ کہ وہاں سرے سے روزہ رکھا ہی نہ جائے، کسی طرح صحیح  
 نہ ہوگا۔ تفقہ کا یہ تقاضا ہے کہ ایسے مقامات پر صحت حکم کو چھوڑ کر کسی دوسری  
 مناسب صورت سے حکم کا منشا پورا کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ رمضان کے لیے  
 ایسے اوقات مقرر کر لیے جائیں جو زمین کی بیشتر آبادی کے اوقات صوم سے  
 ملنے جلتے ہوں۔

یہی صورت میرے نزدیک ان دلائل کیوں کے معاملہ میں بھی اختیار کرنی  
 چاہیے جن کے حکم آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے نکاح دو الگ شخصوں  
 کے کرنے یا سرے سے نکاح ہی نہ کرنے کی تجویزیں غلط ہیں۔ ان کی جگہ  
 ہونا یہ چاہیے کہ ان جمعوا بین الاختین کے ظاہر کو چھوڑ کر صرف  
 اس کے منشا کو پورا کیا جائے۔ حکم کا منشا یہ ہے کہ دو بیویوں کو سوکنے کی

رقابت میں مبتلا کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہاں چونکہ ایسی صورت حال حد پیش ہے کہ دونوں کا نکاح یا تو ایک ہی شخص سے ہو سکتا ہے یا پھر کسی سے نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ فیصلہ انہی دونوں بہنوں پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جانے پر راضی ہیں یا دائمی تجرد کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر وہ پہلی صورت کو خود قبول کر لیں تو ان کا نکاح کسی ایسے شخص سے کر دیا جائے جو انہیں پسند کرے۔ لہذا اگر وہ دوسری صورت ہی کو ترجیح دیں تو پھر اس ظلم کی ذمہ داری سے ہم بھی بے خبری ہیں اور خدا کا قانون بھی۔

اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ بالفرض یہ دونوں ایک شخص کے نکاح میں دے دی جائیں، اور بعد میں وہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دے دے تو کیا ہوگا میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں دونوں اس سے جدا ہو جائیں گی۔ ایک اس لیے کہ اسے طلاق دی گئی اور دوسری اس لیے کہ وہ اس سے کوئی تعلق نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ غلبت اجنبیہ کے مجرم کا ارتکاب نہ کرے، یہی نہیں بلکہ وہ اسے اپنے گھر پر بھی نہیں رکھ سکتا، کیونکہ مطلقہ لڑکی کو اپنے گھر رہنے پر مجبور کرنے کا اسے حق نہیں ہے۔ اور غیر مطلقہ لڑکی بھی اس کے ساتھ نہ ہو۔ لہذا جب وہ ان میں سے ایک کو طلاق دے گا تو دوسری کو خلع کے مطالبے کا جائز حق حاصل ہو جائے گا۔ اگر وہ خلع نہ کرے تو عدالت کا فرض ہے کہ اسے خلع پر مجبور کرے۔ یہ لڑکیاں پیدائش ہی کی وجہ سے ایسی ہیں کہ کوئی شخص نہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی ایک کو طلاق دے سکتا ہے۔ ان کا نکاح بھی ایک ساتھ ہوگا اور طلاق بھی۔ **هَذَا مَا عِنْدِي وَاللَّهُ أَعْلَمُ**

ترجمان القرآن - صفر ۱۳۷۳ھ - نومبر ۱۹۵۳ء

## طلاق قبل از نکاح

سوال :-

میرے ایک غیر شادی شدہ دوست نے کسی دفعتی جذبے کے تحت ایک مرتبہ یہ کہہ دیا تھا کہ ”اگر میں کسی عورت سے بھی شادی کر دوں تو اس پر تین طلاق ہے“ اب وہ اس قول پر سخت نادم ہے اور چاہتا ہے کہ شادی کرے۔ ملا یہ کہتے ہیں کہ چونکہ وہ شادی کرے گا عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس لیے عمر بھر اب شادی کی کوشش کرنا اس کے لیے ایک بے کار اور عبث فعل ہے۔ براہ کرم بتائیں کہ اس مصیبت خیز الجھن سے نکلنے کا کوئی رستہ ہے یا نہیں؟

جواب :-

بلاشبہ فقہائے حنفیہ کی رائے یہی ہے کہ ایسی صورت میں جس عورت سے بھی اس کا نکاح ہو گا اس پر طلاق وارد ہو جائے گی۔ لیکن تمام ائمہ و فقہاء کا اس بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ طلاق کا حق نکاح کے بعد پیدا ہوتا ہے نہ کہ نکاح سے پہلے۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا ہو کہ وہ آئندہ جس عورت سے بھی نکاح کرے اس کو طلاق ہے تو یہ لغو اور

غیر طر بات ہے۔ اس سے کوئی قانونی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ یہی رائے حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت جابرؓ بن عبد اللہ، حضرت ابن عباسؓ، اور حضرت عائشہؓ سے بھی منقول ہے۔ اور اس رائے کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ لا طلاق الا من بعد نکاح (طلاق نہیں ہے مگر نکاح کے بعد) ام مکت کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی خاص عورت یا خاص قبیلے یا خاص خاندان کی عورتوں کے بارے میں کوئی ایسی بات کہے تب تو طلاق لازم آجائے گی، لیکن مطلقاً تمام عورتوں کے بارے میں یہ بات بھی جائے تو طلاق واقع نہ ہوگی۔ کیونکہ پہلی صورت میں تو یہ امکان باقی رہتا ہے کہ مرد اس عورت یا اس قبیلے کی عورت کے سوا دوسری عورتوں سے نکاح کر سکے۔ لیکن دوسری صورت میں ترک سنت کی قیامت قدم آتی ہے۔ اور یہ ایک حلال چیز کو اپنے اوپر مطلقاً حرام کر لینے کا ہم منی ہے۔

اس مسئلے پر مزید تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورہ احزاب صفحہ ۷۲۔  
(ترجمان القرآن، جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ - جنوری ۱۹۵۶ء)

## عَدَّتْ خُلْعَ

سوال :-

آپ کی تصنیف "تغییم القرآن" جلد اول سورہ بقرہ ص ۱۶۹ میں لکھا ہوا ہے کہ "خلع کی صورت میں عدت جرت حیض ہے ہے۔ ماضی

یہ عدت ہے ہی نہیں بکریہ حکم بعض استبراد رحم کے لیے دیا گیا ہے " الا  
اب قابل دریافت یہ امر ہے کہ آپ نے اس مسئلہ کی سند وغیرہ  
نہیں بھی۔ حالانکہ یہ قول مفہوم الایہ اور اقوال معتقین اور قول ابنی صلی اللہ  
علیہ وسلم کے بھی خلاف ہے۔

(۱) فی الفتنہ ، ردی عبد الزاق موطوعا الخدم تطلیقة۔  
(۲) ردی الدارقطنی دامن عدی انه جعل النہی  
الخدم تطلیقة۔

(۳) ردی مالک عن ابن عمرؓ عدتہ المختلعة  
عدتہ المطلقة۔

ایک اور راوی کی روایت ہے کہ عدتہا حیضہ، لیکن یہ قول  
تعرف من الرواة پر محمول کیا گیا ہے اور نص کے بھی خلاف ہے کہ  
نص میں ہے وَالْمُطَلَّقاتُ يَتَوَقَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ مِثْلَةَ  
قَوْبِهِ۔ مہربانی فرما کر احادیث نبویہ میں تطبیق دیتے ہوئے اپنے بلاق  
پر رکھتے ہوئے اور محدثین کے اقوال کو دیکھتے ہوئے مسئلہ کی  
پوری تحقیق مآل بحوالہ کتب معتبرہ تحریر فرمائیں تاکہ باعث الطینان  
ہو سکے۔

جواب :

مختلعة کی عدت کے مسئلے میں اختلاف ہے۔ فقہاء کی ایک جماعت اسے  
مطلقة کی عدت کے مانند قرار دیتی ہے۔ اور ایک معتد بہ جماعت اسے

ایک حیض تک محدود رکھتی ہے۔ اس دوسرے مسلک کی تائید میں متعدد احادیث ہیں۔ نسائی اور طبرانی نے ربیع بنت معوذ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ثابت ابن قیس کی بیوی کے مقدمہ خلع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان تتولین حیضۃ واحدة وتلقی باحدها۔

ابوداؤد اور ترمذی نے ابن عباس رضی کی روایت نقل کی ہے کہ انہی زوجہ ثابت بن قیس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ تعتد بحیضۃ۔

نیز ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ربیع بنت معوذ کی ایک اور روایت بھی اسی مضمون کی نقل کی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن عمر رضی کے حوالہ سے حضرت عثمان رضی کا بھی ایک فیصلہ اسی مضمون پر مشتمل نقل کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بھلا ہے کہ پہلے ابن عمر رضی مختلف کی عدت کے معاملہ میں تین حیض کے قائل تھے، حضرت عثمان رضی کے اس فیصلہ کے بعد انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور ایک حیض کا فتویٰ دینے لگے۔ اسی طرح ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ عدتھا حیضۃ۔ ابن ماجہ نے ربیع بنت معوذ بن عفرہ کے حوالہ سے حضرت عثمان رضی کے مذکورہ بالا فیصلہ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں حضرت عثمان رضی کا یہ قول بھی موجود ہے کہ انما اقبع فی ذالک قضاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

امید ہے کہ ان حوالوں سے آپ کا اطمینان ہو جائے گا۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۱۳۲۶ھ - اکتوبر ۱۹۵۶ء)



## ضبطِ ولادت

سوال ۱۔

آج کل ضبطِ ولادت کو خاندانی منصوبہ بندی کے عنوان پر جدید کے تحت مقبول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے حق معاشی دلائل کے علاوہ بعض لوگوں کی طرف سے مذہبی دلائل بھی فراہم کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جا رہا ہے کہ حدیث میں عزل کی اجازت ہے اور برتھ کنٹرول کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ انہیں اب حکومت کی طرف سے مردوں کو بانجھ بنانے کی سہولتیں بھی بہم پہنچا رہی جا رہی ہیں۔ چنانچہ بعض ایسے ٹیکے ایجاد ہو رہے ہیں جن سے مرد کا جوہر حیات اس قابل نہیں رہتا کہ وہ افزائشِ نسل کا ذریعہ بن سکے لیکن جنسی لذت برقرار رہتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ طریقہ بھی شرعاً قابلِ اعتراض نہیں، اور نہ یہ قبلِ اولاد یا اسقاطِ حمل ہی کے ضمن میں آسکتا ہے۔

براؤ کرم اس بارے میں بتائیں کہ آپ کے نزدیک اسلام اس طرزِ عمل کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟

جواب ۱۔

ضبطِ ولادت کے موضوع پر میں اب سے کئی سال پہلے ایک کتاب ”اسلام اور ضبطِ ولادت“ لکھ چکا ہوں جس میں دینی، معاشی اور معاشرتی

نقطہ نظر سے اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر بحث موجود ہے۔ اب اس کا جدید ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔

آپ کے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ عزل کے متعلق جو کچھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور اس کے جواب میں جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا اس کا تعلق صرف انفرادی ضروریات اور استثنائی حالات سے تھا۔ ضبط ولادت کی کوئی عام دعوت و تحریک ہرگز پیش نظر نہ تھی۔ نہ ایسی کسی تحریک کا مخصوص فلسفہ تھا جو عوام میں پھیلایا جا رہا ہو، نہ ایسی تدابیر وسیع پیمانے پر ہر مرد و عورت کو بتائی جا رہی تھیں کہ وہ باہم مباشرت کرنے کے باوجود استقرارِ حمل کو روک سکیں، اور نہ حمل کو روکنے والی دوائیاں اور آلات ہر کس و نا کس کی دست رس تک پہنچائے جا رہے تھے۔ عزل کی اجازت میں جو چند روایات مروی ہیں ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنے ذاتی حالات یا مجبوریات بیان کیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سامنے رکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیا۔ اس طرح کے جو جوابات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں منقول ہیں ان سے اگر عزل کا جواز نکلتا بھی ہے تو وہ ہرگز ضبط ولادت کی اس عام تحریک کے حق میں استعمال نہیں کیا جاسکتا جس کی پشت پر ایک باقاعدہ خالص مادہ پرستانہ اور اباحت پسندانہ فلسفہ کار فرما ہے۔ ایسی کوئی تحریک اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اٹھتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس پر لعنت بھیجتے اور اسی کے خلاف دلیا ہی جہاد کرتے جیسا

شرک و بدعت و ہستی کے خلاف آپؐ نے کیا۔ میں ہر اس شخص کو جو عز و  
سے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا غلط استعمال کر کے انہیں  
موجودہ تحریک کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے خدا سے ڈرتا ہوں اور  
مشورہ دیتا ہوں کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اس جبارت سے  
باز رہے۔ مغرب کی بے خدا تہذیب و فکر کی پیروی اگر کسی کو کئی ہو تو سیدھی  
طرح اسے دین مغرب سمجھ کر ہی اختیار کرے۔ آخر وہ اسے عین خدا و رسول کی  
تعلیم قرار دے کر خدا کا مزید غضب مول لینے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔

اسلام جس طرح ضبط و لادیت کی عمومی تحریک کو رد نہیں رکھتا، اسی طرح وہ  
قصہ بانجھ بننے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ یہ کہنا کہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو بانجھ  
کر لیا کوئی ناجائز کام نہیں ہے، اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا غلط ہے کہ آدمی کا  
خود کشی کر لیا جائے۔ دراصل اس طرح کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے  
نزدیک آدمی اپنے جسم اور اپنی قوتوں کا خود مالک ہے اور اپنے جسم اور  
اس کی قوتوں کا خود مالک ہے اور اپنے جسم اور اس کی قوتوں کے ساتھ جو کچھ  
بھی کرنا چاہے کہنے کا حق رکھتا ہے۔ اسی غلط خیال کی وجہ سے جاپانی خود کشی  
کو جائز سمجھتے ہیں۔ اسی غلط خیال کی وجہ سے بعض جوگی اپنے ہاتھ یا پاؤں یا  
زبان بیکار کر لیتے ہیں۔ لیکن جو شخص اپنے آپ کو خدا کا مملوک سمجھتا ہو اور یہ سمجھتا  
ہو کہ یہ جسم اور اس کی قوتیں خدا کا عطیہ اور اس کی امانت ہیں اس کے نزدیک اپنے  
آپ کو بانجھ کر لیا دیا ہی گناہ ہے جیسا کسی دوسرے انسان کو زبردستی بانجھ کر  
دینا یا کسی کی بیانی ضائع کر دینا گناہ ہے۔

## ضبطِ ولادت اور وصیتِ العینین

سوال :

دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے آج اسلام کیا حل پیش کرتا ہے؟  
 برتھ کنٹرول و پیدائش روکنے کے لیے موادوں کا استعمال، فیملی  
 پلاننگ وغیرہ کو کیا آج بھی غیر شرعی قرار دے کر ممنوع قرار دیا جائے  
 گا؟ کیا ایک مسلمان زندگی میں اپنی آنکھیں طہیر کر سکتا ہے کہ موت کے  
 بعد کسی مریض کے لیے استعمال ہو سکیں؟ کیا یہ قربانی گناہ تو نہ ہوگی اور  
 قیامت میں یہ شخص اندھا تو نہ اٹھے گا؟

جواب :-

دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اسلام صرف ایک ہی حل پیش کرتا ہے  
 اور وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے مدق کے جو ذرائع پیدا کیے ہیں ان کو زیادہ  
 سے زیادہ بڑھانے اور استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جو ذرائع  
 اب تک مخفی ہیں ان کو دریافت کرنے کی بہیم سعی کی جاتی رہے۔ آبادی  
 روکنے کی ہر کوشش خواہ وہ قبلِ اولاد ہو یا استعاطِ حمل یا منعِ حمل، غلط اور  
 بے حد تباہ کن ہے۔ ضبطِ ولادت کی ترکیب کے چار نتائج ایسے ہیں جن  
 کو روکنا ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جاسکتا۔

۱۔ زنا کی کثرت۔

۲۔ انسان کے اندر خود غرضی اور اپنا معیار زندگی بڑھانے کی خواہش کا اس

حد تک ترقی کر جانا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اپنے قیم بھائیوں اور اپنے دوسرے محتاج امداد رشتہ داروں کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگے۔ کیونکہ جو آدمی اپنی روٹی میں خود اپنی اولاد کو شریک کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ دوسروں کو بھلا کیسے شریک کر سکے گا؟

۲۔ آبادی کے اضافے کا کم سے کم مطلوب معیار بھی جو ایک قوم کو زندہ رکھنے کے لیے ناگزیر ہے برقرار نہ رہنا۔ اس لیے کہ جب یہ فیصلہ کرنے والے افراد ہوں گے کہ وہ کتنے بچے پیدا کریں اور کتنے نہ کریں، اور اس فیصلہ کا مدار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے معیار زندگی کو نئے بچوں کی آمد کی وجہ سے گرنے نہ دیں، تو بالآخر وہ اتنے بچے بھی پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے جتنے ایک قوم کو اپنی قومی آبادی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں کبھی کبھی فوبت یہ بھی آجاتی ہے کہ شرح پیدائش شرح اموات سے کم تر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ فرانس دیکھ چکا ہے، حتیٰ کہ اس کو ”بچے زیادہ پیدا کرو“ کی تحریک چلائی پڑی اور انعامات کے ذریعہ سے اس کی جہت افزائی کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

۴۔ قومی دفاع کا گزند نہ جانا۔ یہ نتیجہ خصوصی طور پر ایک ایسی قوم کے لیے ہے جسے خطرناک ہے جو اپنے سے کئی گنی زیادہ دشمن آبادی میں گھری ہوئی ہے پاکستان کے تعلقات ہندوستان اور افغانستان کے ساتھ جیسے کچھ ہیں سب کو معلوم ہے۔ اور امریکہ کی دوستی نے کیونٹ ممالک سے بھی اس کے تعلقات خراب کر دیئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان، چین، روس اور

افغانستان کی آبادی ہم سے تیرہ گنی ہے۔ ان حالات میں لڑنے کے قابل افراد کی تعداد گھٹانا جیسی عقل مندی ہے اسے ایک صاحب عقل آدمی خود سوچ سکتا ہے۔

آنکھوں کے عیلے کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آسکتے ہیں اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دردانہ اگر کھول دیا جائے تو مسلمان کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہو کر رہے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے۔ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندہ میں دینے کی وصیت کر دے۔ جسم اس وقت تک اس کے تصرف میں ہے جب تک وہ اس جسم میں خود رہتا ہے۔ اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس معاملے میں اس کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رو سے یہ زندہ انسانوں کا فرض ہے کہ اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مرنے والوں کے بعض کارآمد اجزاء زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے، جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم نمبر ۲ کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے، انسانی کھل کو آتار کر اس کو کد باغیت دینے کی کوشش

کی جائے گی تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس، یا مٹی پر س بنائے جاسکیں۔  
 (چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدرس کی ایک ٹیئری کر چکی ہے)۔ انسان کی  
 ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی،  
 حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس قدر وحشت کی طرف پٹ جائے  
 گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان  
 کے اعضاء نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائزہ قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ  
 حد بندی کر کے آپ (اسی جسم کے دوسرے "مفید" استعمالات کو روک سکیں  
 گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔  
 (ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۶۲ء)

## کفارہ جرم اور مسئلہ کفارت

### سوال ۱۔

کیا اگر کسی گناہ (مثلاً زنا) کی شرعی سزا ایک شخص کو اسلامی حکومت  
 کی جانب سے دی جائے تو وہ آخرت میں اس گناہ کی سزا سے بری ہو  
 جائے گا یا کہ نہیں؟

(۲) کیا حدیث یا قرآن میں کوئی اصولی ہدایت اس امر کی موجود  
 ہے کہ ہر شخص اپنی قوم (ذات) میں ہی شادی کرے۔ واضح رہے  
 کہ میں کفارت کا اس معنی میں تو قائل ہوں کہ فریقین میں مناسبت

ہونی چاہیے غیر ضروری معیار کا فرق نہیں ہونا چاہیے۔  
جواب ۱۔

(۱) شرعی سزا جاری ہونے کے بعد آخرت میں آدمی کی معافی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ آدمی نے اس کے ساتھ خدا سے تو بہ بھی کی ہو اور اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہو۔ لیکن اگر بالفرض ایک شخص نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا گیا، مگر اس نے اپنے گناہ پر اپنے خدا کے سامنے کوئی فیصلہ نہ کیا، بلکہ اُٹا دل میں اس شریعت ہی کو کواستارہا جس نے اس کا ہاتھ کٹوایا ہے، تو خدا کے ہاں اس کے معاف کر دیئے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۲) قرآن یا حدیث میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی قوم میں ہی شادی کرے۔ بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا عمل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن - فروری ۱۹۶۱ء)

## عالمی قوانین اور قانونِ شریعت

سوال ۱۔

کیا عالمی قوانین کے نفاذ کے بعد کوئی شخص اگر شریعت کے مطابق کسی قسم کی طلاق دے تو وہ واقع ہو جائے گی؟ متذکرہ



صدر قوانین کی رو سے تو طلاق کے نافذ ہونے کے لیے کچھ خاص شرائط عائد کر دی گئی ہیں۔

جواب :-

کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔ اس لیے جو طلاق شرعی قواعد کی رو سے دے دی گئی ہو وہ عند اللہ اور عند المسلمین نافذ ہو جائے گی خواہ ان قوانین کی رو سے وہ نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً قابل نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہوگی خواہ یہ قوانین اس کو نافذ قرار دیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیے کہ وہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق طے کرنا چاہتے ہیں یا ان عالمی قوانین کے مطابق۔

(ترجمان القرآن - مئی ۱۹۶۲ء)

### منکوحہ کتابیہ کے لیے آزادی عمل کے حدود

اہل کتاب کی جن عورتوں سے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی گئی ہے ان کے بارے میں قرآن مجید دو شرطیں لگاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ محسنات (پاک دامن) ہوں، دوسرے یہ کہ ان سے نکاح کر کے ایک مسلمان خود اپنے ایمان کو خطرے میں نہ ڈال بیٹھے (ملاحظہ ہو سورہ مائدہ آیت ۵) ان شرائط کی رو سے فاسق و فاجر کتابیات کے ساتھ شادی جائز نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنا

کافر فرض ہے کہ جس عورت سے وہ شادی کر رہا ہے وہ اس گھر میں، اس کے خاندان میں، اور اس کے بچوں میں ایسے افعال رائج کرنے کی موجب نہ بنے جو اسلام میں حرام ہیں بلاشبہ وہ اسے مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس کو چرچ جانے سے نہیں روک سکتا۔ مگر اُسے شادی سے پہلے ہی یہ شرط کہ لینی چاہیئے کہ وہ اس کی زوجیت میں آنے کے بعد شراب، سوار کے گوشت اور دوسری حرام چیزوں سے اجتناب کرے گی۔ ایسی شرط پہلے ہی طے کر لینے کا اسے حق بھی ہے اور ایسا کرنا اس کافر فرض بھی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں سخت تساہل کرنے والا آدمی ہے۔ اس کے بعد اگر اس کی اپنی اولاد ان حرام افعال میں مبتلا ہو (اور ظاہر ہے کہ اولاد کا ماں سے متاثر نہ ہونا متوقع نہیں ہو سکتا) تو اس کی ذمہ داری میں وہ بھی شریک ہو گا۔

### نکاح بلا مہر

نکاح بلا مہر ہو سکتا ہے، لیکن اسلامی فقہ کی رو سے اس طرح کے نکاح میں مہر مثل آپ سے آپ لازم آجاتا ہے۔

## اللہ کے حقوق اور والدین کے حقوق

سوال ۱۔

میں ایک سخت کمکش میں مبتلا ہوں ادا آپ کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں جماعت کا مہر دقتی کارکن ہوں ادا اس وجہ سے گھر سے دور رہنے پر مجبور ہوں۔ والدین کا شدید اصرار ہے کہ میں ان کے پاس رہ کر تجارتی کاروبار شروع کر دوں۔ وہ مجھے بار بار خطوط بھیجتے رہتے ہیں کہ تم والدین کے حقوق کو نظر انداز کر رہے ہو۔ میں اس بارے میں ہمیشہ مشوش رہتا ہوں۔ ایک طرف مجھے والدین کے حقوق کا بہت احساس ہے دوسری طرف میں محسوس کرتا ہوں کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے میرا جماعت کا کارکن بن کر رہنا ضروری ہے۔ آپ اس معاملے میں مجھے صحیح مشورہ دیں تاکہ میں انفرادی طور پر پناہ سکوں یہ بھی معلوم ہے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے گھر میں میری زندگی سخت تکلیف کی ہوگی۔ لیکن شرعاً اگر ان کا مطالبہ واجب التعمیل ہے تو پھر بہتر ہے کہ میں اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کر دوں میرے والد صاحب میری ہر بات کو مدد و اعتراض نہ لیتے ہیں ادا میری طرف سے اگر بہت ہی نرمی کے ساتھ جواب عرض کیا جائے تو اسے بھی سستا گوارا نہیں فرماتے۔

## جواب ۱۔

والدین کی اطاعت اور دین کی خدمت کے درمیان توازن کا مسئلہ بالعموم اُن سب نوجوانوں کے لیے وجہ پریشانی بنا رہا ہے جن کے والدین جماعت اسلامی اور اس کے مقصد سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ میں نے عموماً یہ دیکھا ہے کہ ایک بیٹا اگر سرکاری ملازمت میں ہو یا کسی اچھے کاروبار میں لگا ہوا ہو تو والدین اس کے ہزاروں میل دور رہنے کو بھی برداشت کر لیتے ہیں اور اس سے کبھی نہیں کہتے کہ تو ملازمت یا روزگار چھوڑ دے اور آکر ہماری خدمت کر۔ بیٹے کے اظہار اگر فاسقانہ بھی ہوں تو اعتراض کی زبان کھولنے کی ضرورت انہیں بالعموم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اپنے سارے حقوق انہیں مرت اسی وقت یاد آجاتے ہیں جب کوئی بیٹا اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے حتیٰ کہ اگر جماعت اسے معقول معاوضہ دے تب بھی وہ یہی ضد کرتے ہیں کہ بیٹا گھر میں بیچھ کر اُن کے "حقوق" ادا کرے، بلکہ حقوق ادا کرنے پر بھی ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوتا، اس کی ہر بات انہیں کھٹکتی ہے اور اس کی کسی خدمت سے بھی وہ خوش نہیں ہوتے۔ یہ صورت حال میں ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور جماعت کے بھرت نوجوانوں کو اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کرنا پڑ رہا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے ہاں فی الواقع کیا صورت حال ہے۔ اگر وہی کچھ ہے جو آپ کے بیان سے سمجھ میں آ رہی ہے تو یہ آپ کے والدین کی زیادتی

ہے۔ آپ جہاں کام کر رہے ہیں وہیں کرتے رہیں۔ جو کچھ مالی خدمت آپ کے بس میں ہو وہ بھی کرتے رہیں بلکہ اپنے اوتارہ بلیف اٹھا کر اپنی مقدرت سے کچھ زیادہ ہی بھیجتے رہیں۔ اور حسب ضرورت وقتاً فوقتاً ان کے پاس ہو آیا کریں۔ لیکن اگر صورت حال اس سے مختلف ہو اور فی الواقع آپ کے والدین اس بات کے محتاج ہوں کہ آپ کے لیے ان کے پاس رہ کر ہی خدمت کرنا ضروری ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں۔  
(ترجمان القرآن، جمادی الاول ۱۳۷۵ھ، جنوری ۱۹۵۶ء)

## پرہیز اور پسند کی شادی

سوال ۱۔

اسلامی پردے کی رُو سے جہاں ہیں بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں وہاں دو ایسے نقصانات بھی ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا بجز اس کے کہ صبر و شکر کے ساتھ جائیں۔

اول یہ کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی جس کا ایک خاص ذوق ہے اور جو اپنے دوست منتخب کرنے میں ان سے ایک خاص اخلاق اور ذوق کی توقع رکھتا ہے، فطرتاً اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ شادی کے لیے ساتھی بھی اپنی مرضی سے منتخب کرے۔ لیکن اسلامی پردے کے ہوتے ہوئے کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کے لیے اس بات

گنجائش نہیں رہتی کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا سامتی چنے بلکہ اس کے لیے وہ قطعاً دوسروں یعنی ماں یا خالہ وغیرہ کے دستِ نگر ہوئے ہیں ہماری قوم کی تعلیمی حالت ایسی ہے کہ والدین عموماً اُن پٹھہ اور اڈاچ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اس لیے والدین سے یہ توقع رکھنا کہ موزوں رشتہ ڈھونڈھ لیں گے ایک عبث توقع ہے۔ اس صورت حال سے ایک ایسا شخص جو اپنے مسائل خود حل کرنے اور خود سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک لڑکی جو گھر سے باہر نکلنے کی پابند ہو وہ کیونکر ایسی وسعتِ نظر، فراست اور عقلِ عام کی مالک ہو سکتی ہے کہ بچوں کی بہترین تربیت کر سکے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح سے بیدار کر دے، اس کو تو دنیا کے معاملات کا صحیح علم ہی نہیں ہو سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی تعلیم بھی حاصل کر لے جتنی ایک بے پردہ لڑکی نے حاصل کی ہوتی ہے تو بھی اس کی ذہنی سطح کم ہو گی کیونکہ اسے اپنے علم کو عملِ طور پر پرکھنے کا کوئی موقع ہی حاصل نہیں۔ امید ہے آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے۔

جواب :-

آپ نے اسلامی پردے کی جن خرابیوں کا ذکر کیا ہے اولاً تو وہ ایسی خرابیاں نہیں ہیں کہ اس کی بنا پر آدمی لائیکل مشکلات میں مبتلا ہو جائے اور

ثانیاً حیاتِ دنیوی میں آخر کو فی الہی چیز ہے جس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن کسی چیز کے مفید یا مضر ہونے کا اس کے صرف ایک یا دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر اس میں مصلح کو غلبہ حاصل ہے یا مفاسد کو۔ یہی اصول پردے کے بارے میں اختیار کیا جائے گا۔ اسلامی پردہ آپ کی رائے میں بھی بے شمار فوائد کا حامل ہے۔ لیکن فقط یہ مشکل کہ اس کی پابندی سے آدمی کو شادی کے لیے اپنی مرضی کے مطابق لڑکی منتخب کرنے کی آزادی نہیں مل سکتی، پردے کی افادیت کو کم یا اس کی پابندی کو ترک کرنے کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ بلکہ اگر ہر لڑکے کو لڑکی کے انتخاب اور ہر لڑکی کو لڑکے کے انتخاب کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو اس سے اس قدر قبیح نتائج برآمد ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور پھر خاندانی نظام جو کہ معاشرے کی مضبوطی اور پاکیزگی کا ضامن ہوتا ہے درہم دبرہم ہو کر زوال پانے لگا۔ اور ایک مہم جو مشکل کو حل کرتے کرتے بے شمار حقیقی مشکلات کے دروازے کھل جائیں گے۔

آپ کا یہ خیال کہ پردہ لڑکی وسعتِ نظر اور فراست سے بے بہرہ ہوتی ہے درست نہیں ہے۔ اور اگر اسے بالفرض درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں پردے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ایک لڑکی پردہ رکھ کر بھی علم و فن میں کمال پیدا کر سکتی ہے اور اس کے مقابلے میں پردے سے باہر ہو کر بھی ایک لڑکی علم و عقل اور فراست و بصیرت سے کوری

رہ سکتی ہے۔ البتہ بے پردہ لڑکی کو یہ فوقیت ضرور ہوگی کہ وہ معلومات کے لحاظ سے چاہے وسیع النظر نہ ہو لیکن تعلقات کے لحاظ سے ان کی نگاہیں فرض پھیل جائیں گی۔ ایسی حالت میں اگر موزوں ترین رفیق حیات کی تلاش میں کامیابی ہو بھی جائے، تب بھی جو نگاہیں وسعت کی عادی ہو چکی ہوں انہیں سیٹ کر ایک مرکز تک محدود رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

## پسند کی شادی میں رکاوٹیں

جواب ۱:-

آپ کا جواب ملا۔ مگر مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ آپ نے اُسے بالکل معمولی مسئلہ قرار دیا۔ کامیاب شادی کی تمنا تو ایک جائز خواہش ہے اور ایسے حالات پیدا کرنا، جن کی وجہ سے ایک شخص کے لیے اپنی پسند کی لڑکی چننے کا راستہ بند ہو جائے میں انسانی مسرت اور شخصیت کے ارتقاء کے لیے مضر سمجھتا ہوں اور دین فطرت کے منافی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ہمارے مروجہ طریقے کے مطابق عورت زیادہ سے زیادہ گھر کی منتظم ہوتی ہے اور خاوند کی اور اپنی جنسی تسکین کا ایک ذریعہ، لیکن دو افراد کے اپنے آپ کو پوری طرح ایک دوسرے کے حوالے کرنے اور زندگی کے فرائض ایک بار کی بجائے خوشی خوشی پورا کرنے کے جو امکانات اپنی پسند اور ذوق کی شادی کر لینے میں ہوتے



ہیں وہ اس وحدت میں قطعاً ممکن نہیں کہ اپنی پسند اور بصیرت استعمال کیے بغیر کسی دوسرے کے انتخاب پر شادی کر لی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ایک نوجوان محض جنسی تسکین کا خواہشمند نہیں ہوتا، وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی کے لیے کچھ قربانی کرے، کسی سے محبت کرے، کسی کی خوشی کا خیال رکھے اور کوئی اس کی خوشی پر خوش ہو۔ اس جذبے کے فطری نکاس کا راستہ تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جسے اس نے تعلیم، اطوار، کردار اور دوسری خوبیوں کی بنا پر اپنی طبیعت کے مطابق حاصل کیا جا رہا ہے (حقیقی محبت کسی کی باطنی خوبیوں کے دیکھنے سے ہی پیدا ہوتی ہے نہ کہ شکل دیکھ لینے سے) اور یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ پہلے تو کسی کی شادی کرادی جائے اور پھر اس سے مطالبہ کیا جائے کہ اب اسے چاہو اور یوں جیسے تم نے اس کو خود پسند کیا ہے۔ اس فطری محبت کا راستہ بند کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جذبہ اپنے لیے دوسرے راستے نکال لیتا ہے۔

پہرے کی وجہ سے جو حالات پیدا ہیں ان میں حقیقتاً کہہ داریکھ کرہ برتلاش کرنا ممکن نہیں۔ لڑکے کے باپ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ لڑکی کا پتہ چلا سکے، لڑکی کی والدہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ لڑکے کے متعلق براہ راست کچھ اندازہ لگا سکے۔ کیونکہ پہرے کی وجہ سے ان افراد میں بھی تعلق اور آزادانہ گفتگو ناممکن ہے۔ (خود لڑکے اور لڑکی کا ملنا تو ایک طرف رہا) بڑی سے بڑی آزادی جو اسلام نے دی ہے وہ یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کی شکل دیکھ لے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کی شکل چند سیکنڈ دیکھ لینے سے کیا

ہو جاتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے، اب تو تمام علماء نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ موجودہ تمدنی ضروریات پوری کرنے کے لیے علم کا حاصل کرنا عورتوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی کام کر سکتی ہیں۔ یا تو اسلامی احکام کی پابندی کریں یا علم حاصل کریں۔ پردے کی پابند ہوتے ہوئے میری کچھ میں نہیں آتا کہ طبقات اللہ من، آثار قدیہ، انجیلز، رنگ اور تمام ایسے علوم جن میں سر دے اور دردِ دوزخ سفر کی ضرورت ہوتی ہے، ان علوم کے لیے خواتین کس طرح کام کر سکتی ہیں جب کہ حرم کے بغیر عورت کا تین دن سے زائد کی مسافت پر نکلنا بھی منع ہے۔ اب کیا ہر جگہ وہ اپنے ساتھ حرم کو لیے لیے پھرے گی؟

یہ علوم تو ایک طرف رہے، میں تو ڈاکٹری اور پردے کو بھی ایک دوسرے کی ضد سمجھتا ہوں۔ اول تو ڈاکٹری کی تعلیم ہی جو جسمانیات کی نگاہیں بھیلو دینے والے مخلوقات سے پُر ہوتی ہے، جیسا کہ اس احساس کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہے جس کی مشرقی عورتوں سے توقع کی جاتی ہے۔ خواہ وہ ڈاکٹری پر دے ہی میں سیکھی جائے اور پڑھانے والی تمام خواتین ہی کیوں نہ ہوں۔ دوم ڈاکٹر بننے پر ایک خاتون کو مریضوں کے لواحقین سے روابط کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیے غیر مریدانہ بات چیت پر قدغن لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس کے پیش نظر اگر ہم خواتین کو ڈاکٹر بننے سے روکتے ہیں تو پھر ہمیں اپنے گھروں کی مریض خواتین کے ہر مرض کے علاج کے

یہ مرد ڈاکٹروں کی خدمات کی ضرورت پڑے گی اور رائج الوقت نظریہ حیا کے مطابق یہ تو اس سے بھی زیادہ معیوب سمجھا جائے گا۔

جناب عالی آپ مجھے بتائیں کہ ان معاشرتی اور تمدنی الجھنوں کا اسلامی احکامات کی پابندی کرتے ہوئے کیا حل ہے ؟

جواب :-

آپ کا دوسرا خط ملا۔ شادی کے معاملے میں آپ نے جو الجھن بیان کی ہے وہ اپنی جگہ درست ہی ہے، اس کا حل کورٹ شپ کے سوا اور کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ جس تحصیل کے ساتھ رفیق زندگی بنانے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے کے اوصاف، مزاج، عادات، اخلاقیات اور ذوق و ذہن سے واقف ہونے کی ضرورت آپ محسوس کرتے ہیں، ایسی تفصیل و اقصیت درچار ملاقاتوں میں، اور وہ بھی رشتہ داروں کی موجودگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے مہینوں ایک دوسرے کے ساتھ ملنا تنہائی میں بات چیت کرنا، سیر تفریح، سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا اور بے تکلف دوستی کی حد تک تعلقات پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ کیا واقعی آپ یہی چاہتے ہیں کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان اس اختلاط کے مواقع بہم پہنچے جائیں۔ آپ کے خیال میں ان جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اندر ان معصوم فلسفیوں کا فی حدی تناسب کیا ہوگا جو بڑی سنجیدگی کے ساتھ صرف رفیق زندگی کی تلاش میں مخلصانہ تحقیقاتی رویہ قائم کریں گے اور اس دوران میں شادی ہونے تک اس طبعی جذبہ و انجذاب کو قابو میں رکھیں گے جو خصوصیت کے

ساتھ نوجوانی کی حالت میں عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے اپنے اندر رکھتے ہیں؛ بحث برائے بحث اگر آپ نہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ شاید دو تین فی صدی سے زیادہ ایسے لوگوں کا اوسط ہماری آبادی میں نکلے گا۔ باقی اس امتحانی دور ہی میں فطرت کے تعاضے پورے کر چکے ہوں گے اور وہ دو تین فی صدی جو اس سے پنج نکلیں گے، وہ بھی اس شبہ سے بچ سکیں گے کہ شاید وہ باہم ٹوٹ ہو چکے ہوں۔

پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لڑکا اور لڑکی جو اس تلاش و حقیقت کے لیے باہم غلط کریں گے وہ لازماً ایک دوسرے کو رفاقت کے لیے منتخب کر لیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ ۲۰ فی صدی دوستیوں کا فیجہ نکاح کی صورت میں برآمد ہو۔ ۸۰ فی صدی یا کم از ۵۰ فی صدی کو دوسرے مافیہ کے تجربے کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس صورت میں ان "تعلقات" کی کیا پوزیشن ہوگی جو دورانِ تجربہ میں آئندہ نکاح کی امید پر پیدا ہو گئے تھے اور ان شبہات کے کیا اثرات ہوں گے جو تعلقات نہ ہونے کے باوجود ان کے متعلق معاشرے میں پیدا ہو جائیں گے؟

پھر آپ یہ بھی مانیں گے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ان مواقع کے دروازے کھولنے کے بعد انتخاب کا میدان لامحالہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ ایک ایک لڑکے کے لیے صرف ایک ہی ایک لڑکی مطیع نظر نہ ہوگی جس پر وہ اپنی نگاہ انتخاب مرکوز کر کے تحقیق و امتحان کے مراحل طے کرے گا اور علیٰ ہذا القیاس لڑکیوں میں سے بھی ہر ایک کے لیے ایک ہی ایک لڑکا امکانی شوہر کی حیثیت سے زیرِ امتحان نہ ہوگا۔ بلکہ شادی کی منہدی میں ہر طرف ایک جاذب

نظر مال موجود ہوگا جو امتحانی مراحل سے گزرتے ہوئے ہر لڑکے کے ہر لڑکی کے سامنے بہتر انتخاب کے امکانات پیش کرتا رہے گا۔ اس وجہ سے اس امر کے امکانات روز بروز کم ہوتے جائیں گے کہ ابتدائے وجود و فرد ایک دوسرے سے آزمائشی ملاقاتیں شروع کریں وہ آخر وقت تک اپنی اس آزمائش کو نباہیں اور بالآخر ان کی آزمائش شادی پر منتج ہو۔

اس کے علاوہ ایک فطری امر ہے کہ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ جو روانی طرز کا کورٹ شپ کرتے ہیں ان میں دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے روشن پہلو ہی دکھاتے ہیں۔ مہینوں کی ملاقاتوں اور گہری دوستی کے باوجود ان کے کمرہ پہلو ایک دوسرے کے سامنے پوری طرح نہیں آتے۔ اس دوران میں شہوانی خواہش اتنی بڑھ چکی ہوتی ہے کہ وہ جلدی سے شادی کر لینا چاہتے ہیں، اور اس غرض کے لیے دونوں ایک دوسرے سے ایسے ایسے بیان و قیامد کرتے ہیں، اتنی محبت اور گرویدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ شادی کے معاملات کی زندگی میں وہ عاشق و معشوق کے اس پارٹ کو زیادہ دیر تک کسی طرح نہیں نباہ سکتے، یہاں تک کہ جلدی ہی ایک دوسرے سے مایوس ہو کر طلاق کی نوبت آ جاتی ہے۔ کیونکہ دونوں ان توقعات کو پورا نہیں کر سکتے جو عشق و محبت کے دور میں انہوں نے باہم قائم کی تھیں اور دونوں کے سامنے ایک دوسرے کے وہ کمرہ پہلو آ جاتے ہیں جو معاملات کی زندگی ہی میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ عشق و محبت کے دور میں کبھی نہیں کھلتے۔

اب آپ ان پہلوؤں پر بھی غور کر کے دیکھ لیں۔ پھر آپ مسلمانوں کے موجودہ طریقے کی، مروجہ قباحتوں اور اس کورٹ شپ کے طریقے کی قباحتوں کے درمیان موازنہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ آپ کو ان دونوں میں سے کونسی قباحتیں زیادہ قابل قبول نظر آتی ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی آپ کورٹ شپ ہی کو زیادہ قابل قبول سمجھتے ہیں تو مجھ سے بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو خود یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس اسلام کے ساتھ آپ اپنا تعلق رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں جو اس راستے پر جانے کی اجازت دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہے۔ یہ کام آپ کو کرنا ہوتا کوئی دوسرا معاشرہ تلاش کریں۔ اسلام سے سرسری واقفیت بھی آپ کو یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اس دین کی حدود میں ”کامیاب شادی کا وہ نسخہ استعمال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جسے آپ مباح کرنا چاہتے ہیں۔“

عورتوں کی تعلیم کے متعلق آپ نے جن مشکلات کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ فطرت نے عورت اور مرد کے دائرہ کار الگ رکھے ہیں۔ اپنے دائرہ کار کے فرائض انجام دینے کے لیے عورت کو جس بہتر سے بہتر تعلیم کی ضرورت ہے وہ اسے ضرور ملنی چاہیے اور اسلامی حدود میں وہ پوری طرح دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے ایسی علمی و ذہنی ترقی بھی ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے جو عورت کو اپنے دائرہ کار کے فرائض انجام دیتے ہوئے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس معاملہ میں کوئی انتظامات نہ کرنا مسلمانوں کی

کوتاہی ہے نہ کہ اسلام کی۔ لیکن وہ تعلیم جو مرد کے دائرہ کار کے لیے عورت کو تیار کرے عورت ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تباہ کن ہے اور اس کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں ہے۔ اس مسئلے پر تفصیل بحث کے لیے آپ میری کتاب ”پردہ“ کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۵ - عدد ۴ - جنوری ۱۹۶۱ء)

## لفظ نکاح کا اصل مفہوم

سوال :-

ترجمان القرآن بابت ماہ مارچ ۱۹۶۲ء میں تبصیر القرآن کے تحت آپ نے جو احکام مستنبط فرمائے ہیں، ان میں سے پہلے ہی مسئلہ میں آپ نے بیان فرمایا ہے کہ ”قرآن نکاح کا لفظ بول کر صرف عقد مراد لیتا ہے“ یا قرآن اسے اصطلاحاً ”صرف عقد کے لیے استعمال کرتا ہے“ یہ قاعدہ کلیتہً نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاں کے غالب فقہی مسلک یعنی حنفیہ کے نزدیک ناقابل تسلیم ہے بلکہ جمہور اہل تفسیر کی تصریحات کے بھی منافی ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسی بات جس کے حق میں شاید ہی کسی نے رابٹ دی ہو آپ نے قاعدہ کلیتہً کے طور پر بیان فرمادی ہے۔

یہ ایک لمبی بحث ہے کہ لغت کے اقتدار سے نکاح کے معنی کیا ہیں علمائے لغت میں اس امر پر بہت کچھ اختلاف ہوا ہے کہ عربی زبان میں نکاح کے اصل معنی کیا ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطنی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ ان دونوں میں مشترک ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی عقد تنہیج کے ہیں اور وطنی کے لیے اور عقد کے لیے مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ اس کے اصل معنی وطنی کے ہیں اور عقد کے لیے مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن راغب اصفہانی نے پورے نعرے کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ ”لفظ نکاح کے اصل معنی عقد ہی کے ہیں۔ پھر یہ لفظ استعارۃً جماع کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور یہ بات محال ہے کہ اس کے اصل معنی جماع کے ہوں اور استعارے کے طور پر اسے عقد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔“ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ جتنے الفاظ بھی جماع کے لیے عربی زبان میں یا دنیا کی کسی دوسری زبان میں حقیقتہً وضع کیے گئے ہیں وہ سب فحش ہیں۔ کوئی شریف آدمی کسی مہذب مجلس میں ان کو زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لفظ حقیقتہً اس فعل کے لیے وضع کیا گیا ہو اُسے کوئی معاشرہ شادی بیاہ کے لیے مجازاً و استعارہ کے طور پر استعمال کرے اس معنی کو ادا کرنے کے لیے تو دنیا کی ہر زبان میں مہذب الفاظ ہی استعمال کئے گئے ہیں نہ کہ فحش الفاظ۔

علمائے اخاف بالعموم یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لفظ حقیقتہً وطنی کے لیے



اور مجازاً عقد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ اخلاف کی متفق علیہ رائے نہیں ہے۔ بعض مشائخ حنفیہ اس لفظ کو دہلی اور عقد کے درمیان مشترک معنوی بھی قرار دیتے ہیں۔ پھر نکاح کی شرعی تعریف تو ان کے ہاں یہ ہے کہ ”جو عقد یضید ملک المتعہ قصداً“ یا ”عقد وضع لتعلیث منافع البض“

میرے نزدیک قرآن و سنت میں نکاح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد لازماً عقد تزویج ہی ہے اور جب یہ لفظ مطلقاً استعمال ہوگا تو اس سے مراد عقد ہی لیا جائے گا الا یہ کہ کوئی قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ یہاں مراد بعض دہلی یا عقد منع الدہلی ہے۔ رہی دہلی جو عقد تو اس کے لیے لفظ نکاح کے استعمال کا جواز سنت میں تو ہو سکتا ہے لیکن قرآن و سنت میں اس کی کوئی مثل میرے علم میں نہیں ہے۔ تب کے علم میں ہو تو پیش فرمائیں۔

اس کے جواب میں سائل نے فقہ کی بعض کتابوں سے مفصل عبارتیں نقل کر کے بھیجیں۔ اس پر ان کو حسب ذیل جواب ملا گیا۔ (م)

افسوس ہے کہ کسی مسئلے پر زیادہ طویل بحث کی فرصت مجھے میسر نہیں تاہم اجمالاً ایک بار پھر اپنے مدعا کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد بھی اطمینان نہ ہو تو مضائقہ نہیں۔ آپ اپنی رائے پر قائم رہ سکتے ہیں اور میں اپنی رائے پر۔ نکاح سے مراد عقد اور دہلی بعد عقد لینے میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے مراد دہلی بغیر عقد بھی لی جاسکتی ہے؟ اس چیز کے ماننے میں مجھے تامل ہے کیونکہ شرعاً اس کے لیے زنا اور سفاح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اس قبیل فعل پر لفظ نکاح کا اخلاقی جائز تسلیم

کرنے کے لیے ان دلائل سے زیادہ قوی دلائل کی ضرورت ہے جو آپ نے نقل فرمائے ہیں۔

یہ بات بھی قابل تسلیم نہیں ہے کہ نکاح کا لفظ اصلاً فعل مباشرت کے لیے وضع ہوا تھا اور پھر مجازاً عقد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ فعل مباشرت کے لیے دنیا کی جس زبان میں بھی کوئی لفظ وضع ہوا ہے (یعنی جو استعارہ و کنایہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ صراحتہً اسی فعل کے لیے موضوع ہے) وہ قبیح و شنیع ہے اور کسی زبان میں بھی اس کو عقد کے لیے مجازاً استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اُردو زبان میں اس فعل کے لیے جو لفظ مستعمل ہے اسے آخر کون شخص بیاہ کے لیے استعمال کرتا ہے۔

خود آپ کے پیش کردہ حوالوں سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ لفظ نکاح کے اصل معنی ختم کے ہیں۔ اس کی یہ بات ماننے کے لائق ہے کہ یہ لفظ اصلاً مجرد فعل مباشرت کے لیے (بلا لحاظ اس کے کہ عقد ہو یا نہ ہو) وضع ہوا تھا؟ بلاشبہ ایسی مثالیں لغت میں ملتی ہیں جن میں یہ لفظ محض مباشرت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس لفظ کا اصل مفہوم مباشرت ہے اور عقد کے لیے یہ مجازاً استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن اور حدیث سے جو مثالیں آپ نے دی ہیں ان پر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جس کی دوسری تائید ممکن ہو۔ مثلاً میں زمانے سے مرست معاہرت کا قائل ہوں۔ مگر میرے نزدیک قرآن کی آیت **وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاءُكُمْ** کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ”جن

عورتوں سے تہا رہا باپ زنا کر چکا ہو ان سے تم نہ زنا کرو اور نہ عقد یہ بکریں اس کا مطلب یہی لیتا ہوں کہ جن عورتوں سے باپ کا نکاح ہو چکا ہو، ان سے اولاد کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس سے بالذات یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ باپ سے جس عورت کا بھی شہوانی تعلق کسی طرح ہو گیا ہے وہ بیٹے پر حرام ہے اور بیٹے کا تعلق جس عورت سے ہو گیا ہے وہ باپ پر حرام ہے۔ فانکح الیہ ملعون میں یہی نہیں یہی سمجھتا ہوں کہ حضورؐ نے استعارہ کی زبان میں استثناء پالید کرنے والے کو ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو اپنے ہی ہاتھ سے بیاہ کر رہا ہے۔ ایسی ہی تاویل دوسرے نظائر کی بھی کی جاسکتی ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، ص ۶۲۸ - ستمبر ۱۹۶۲ء)

## عورت کی عصمت و عفت کا مستقبل

سوال :-

مارننگ نیوز (کراچی) کا ایک کٹنگ ارسال خدمت ہے۔ اس میں انگلستان کی عدالت طلاق کے ایک سابق جج سر ہربرٹ ولنگٹن نے ایک مکمل بیوی کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ اس کٹنگ کا ترجمہ یہ ہے۔  
 رومن کیتھولک عدالت طلاق کے سابق جج سر ہربرٹ ولنگٹن نے اپنے ایک فیصلہ میں ایک مکمل بیوی کی چودہ خصوصیات گنائی ہیں جن

کی تفصیل ہے۔  
 صدی کشش، عقلندی، محبت، نرم خوئی، شفقت، خوش  
 اطواری، جذبہ تعاون، صبر و تحمل، غور و فکر، بے غرضی، خندہ روئی  
 ایشہ، کام کی لگن اور وفاداری۔

سربرہٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا ہے کہ یہ تمام خصوصیات ان  
 کی دوسری بیوی میں موجود تھیں جس سے انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء  
 میں اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد شادی کی تھی۔ سربرہٹ جنہوں  
 نے اپنی عدالت میں سیکرٹریوں کو فسخ کیا ہے ۸۶ برس  
 کی عمر پر جنوری ۱۹۹۲ء میں وفات پا گئے ہیں۔

اس کٹنگ سے واضح ہوتا ہے کہ سربرہٹ ہرٹ نے عفت یا  
 پاکدامنی جیسی خوبی کو ان چودہ نکاتی فہرست میں برائے نام بھی داخل کرنا  
 ضروری نہیں سمجھا۔ گویا اب پاکدامنی کا شمار عورت کی خوبیوں میں نہیں  
 کیا جاتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک عورت پاکدامنی کے بغیر کس  
 طرح خاندان کی ذمہ دار رہ سکتی ہے؟

جواب :-

آپ کا معنیت نامہ طاحس کے ساتھ آپ نے انگلستان کی ایک عدالت  
 طلاق کے جج کی وصیت ارسال کی ہے اور مجھے اس پر اظہار خیال کی دعوت  
 دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل مغرب کے ہاں سے یہ خیال اب قریب قریب  
 ختم ہی ہو چکا ہے کہ پاکدامنی بھی عورت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔

اختلاط مردوزن کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ہاں بدکاری بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ معاشرے کو اب اس کے رواج عام سے اپنے آپ کو مانوس کرنا پڑا۔ اب وہاں کوئی شخص بھی یہ توقع نہیں رکھتا کہ شادی کے روز اسے بیوی کو ملے گی اور شادی کے بعد بھی وہ باعفت اور وفادار رہے گی۔ وہاں مرد بالعموم کورٹ شپ کے دوران میں خود اپنی ہونے والی بیوی سے زنا کر چکا ہوتا ہے اور اکثر شادی ہی اس وقت ہوتی ہے جب لڑکی حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں آخر آپ یہ توقع ہی کیسے کر سکتے ہیں کہ ان کے ہاں اب تک پاکدامنی عورت کی ایک محدود صفت اور بیوی کی ایک لازمی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا کیا ذکر ہے۔ ہمارے حکمران لمبھوں اور اپنی سوسائٹی کے لوگوں کی بدولت اب جس رفتار سے ہمارے ہاں اختلاط مردوزن بڑھ رہا ہے اور خاندان منصوبہ بندی کے نام سے ضبط ولادت کے طریقوں کو جس طرح عام کیا جا رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے خود ہمارے ہاں یہی حالت پیدا ہوتے نظر آتے ہیں۔ خدا ان لوگوں کو یا تو ہدایت دے یا پھر ہماری قوم کو ان سے نجات دے جو خود بگڑے ہیں اور ساری قوم کو بگاڑ دینے پر تے ہوئے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۸، عدد ۶۔ ستمبر ۱۹۶۶ء)

## بیوی اور والدین کے حقوق

سوال :-

میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں، جن سے ذہن کی بہت سی گہری کھل گئی ہیں۔ لیکن ایک چیز جو پہلے بھی دل میں کھسکتی تھی اور اب بھی کھسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں عورتوں کا درجہ کافی بلند کیا ہے، وہاں بحیثیت بیوی کے بعض امور میں اس کو حقیر بھی کر دیا ہے۔ مثلاً اس پر تین تین سو کنوں کا جلا پاجانزہ کر دیا ہے، حالاں کہ قدرت نے عورت کی فطرت میں حسد بھی رکھا ہے۔ اسی طرح جہاں بیوی کو شوہر کے قبضہ و اختیار میں رکھا گیا ہے، وہاں شوہر کو اپنے والدین کے قبضہ و اختیار میں کر دیا ہے۔ اسی طرح شوہر والدین کے کہنے پر بیوی کی ایک جائز خواہش کو بھی پامال کر سکتا ہے۔ ان امور میں بظاہر بیوی کی حیثیت چار پیسے کی گڑیا سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ میں ایک عورت ہوں اور قدرتی طور پر عورت کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہوں۔ آپ براہ کرم اس بارے میں میری تشغی فرمائیں۔

جواب :-

آپ نے دو دُوحہ کی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عورت کی پوزیشن خانگی زندگی میں فردِ تر رکھی گئی ہے۔ ایک یہ کہ مرد کو چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے دوسرے یہ کہ شوہر کو والدین کا تابع رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے

بہاؤدات وہ اپنی بیوی کے جذبات اور اس کی خواہشات کو والدین کی رضا پر قربان کر دیتا ہے۔ ان دوجہ میں سے پہلی وجہ پر اگر آپ غور کریں تو یہ بات بہت آسانی کے ساتھ آپ کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ عورت کے لیے تین سوکنوں کا برداشت کرنا جتنا تکلیف دہ ہے اس سے بدرجہا زیادہ۔ تکلیف دہ چیز اس کے لیے ہو سکتی ہے کہ اس کے شوہر کی کئی کئی محبوبائیں اور داشتائیں ہوں۔ اسلام نے اسی کو روکنے کے لیے مرد کو ایک سے زائد نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایک مرد نا جائز تعلقات میں جنابے پاک ہو سکتا ہے، شادیاں رچانے میں اتنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شادی کی صورت میں مرد کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور طرح طرح کی پیمیدگیوں سے اسے ساتھ پیش آتا ہے۔ یہ دراصل عورتوں ہی کے فائدے کے لیے ایک روک تھام ہے نہ کہ مردوں کے لیے بے جا رعایت۔ دوسرے طریقے کا تجربہ آجکل مغرب کی سوسائٹی کر رہی ہے وہاں ایک طرف تو جائز سوکنوں کا سد باب کر دیا گیا ہے لیکن دوسری طرف نا جائز سوکنوں سے عورت کو بچانے کا کوئی انتظام اس کے سوا نہیں کیا گیا کہ وہ انہیں برداشت نہ کر سکے تو شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لیے عدالت میں نالش کر دے۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس سے عورت کی مصیبت کچھ کم ہو گئی ہے؟ چھری چھانک عورت تو شاید سوکن سے بچنے کے لیے طلاق کو آسان سمجھ لے مگر کیا بچوں والی عورت کے لیے بھی یہ نسخہ آسان ہے؟

دوسری جس شکایت کا اظہار آپ نے کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ غالباً آپ ابھی تک صاحب اولاد نہیں ہیں، یا اگر ہیں تو آپ کے کسی لڑکے کی

ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ آپ اس خاص معاملے کو ابھی تک صرف بہو کے نقطہ نظر سے دیکھ رہی ہیں۔ جب آپ اپنے گھر میں خود بہو لے آئیں گی اور اس معاملے پر ماں کی حیثیت سے نمود کریں گی تو یہ مسئلہ اچھی طرح آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ بیوی کے حقوق کتنے ہونے چاہئیں اور ماں باپ کے کتنے، بلکہ اس وقت شاید آپ خود انہی حقوق کی طالب ہوں گی جن پر آج آپ کو اعتراض ہے۔

(ترجمان القرآن ربیع الاول ۱۳۷۶ھ - نومبر ۱۹۵۶ء)

## قرآن میں زنا کی سزا

سوال ۱۔

آپ نے میرے مضمون ”قرآن میں چور کی سزا“ پر حوالہ دیا۔ خیال فرمائیے اس کے لیے شکریہ۔ اب اسی قسم کا ایک اور مضمون ”قرآن میں زنا کی سزا“ کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ میری استدعا ہے کہ آپ اس پر بھی اظہار خیال فرمائیں، اگر خدا کو متعلقہ ہوا تو جناب کی دونوں تنقیدیں کا ایک بجا جواب دوں گا۔

یہاں سرسری طور پر اس قدر گزارش کرنا ضروری ہے کہ آپ نے میری اس قسرت کے بارے میں محنت چینی نہیں فرمائی کہ قرآن نے جو مسئلہ بیان کی ہے وہ زیادہ سے زیادہ منرا ہے، اور کم سے کم سزا بیچ



کی قوتِ تیزی پر منحصر ہے۔ اور نہ اس بارے میں کچھ فرمایا کہ دنیا میں کسی جرم کی سزا مجرم کو آخرت کی سزا سے محفوظ رکھتی ہے۔

نوٹ : مستفسر کے محمولہ بالا مضمون کے چند جزوی

اقتباسات درج ذیل ہیں؛ تاکہ ان کی روشنی میں جواب کو

دیکھا جاسکے۔

”ہم اپنے مضمون (قرآن میں چور کی سزا) میں تباہی کے سارقہ

سے مراد سرقہ کے تمام مددگار لوگ ہیں؛ خواہ وہ سڑنٹ ہوں یا مذکر،

اور خود عورت اگر چور ہے تو وہ لفظ سارق میں بھی داخل ہے اور

سارقہ بھی ہے۔ یہاں بھی (آیت الذانیۃ والذانیۃ) وہی کیفیت

ہے۔ زانیہ میں فعلِ زنا کے تمام مددگار لوگ شامل ہیں؛ خواہ وہ دلال

ہوں، دلالہ ہوں یا پیغام رساں ہوں، یا زانیوں کے لیے آسانیاں فراہم

کرنے والے، یا زنا کے مفعول ہوں، وغیرہ وغیرہ۔“

”چور کی سزا کو بیان کرتے ہوئے ”سارقہ“ کو سارق کے بعد لایا گیا

تھا، آخر کوئی وجہ ہونی چاہیے کہ یہاں زانیہ کو زانی سے پہلے لایا گیا۔

نہیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چوری کے جرم میں بڑا مجرم چور ہوتا

ہے اور اس کے مددگار بعد میں۔ مگر زنا کی صورت میں زنا کے مددگار

(یعنی زانیہ) زانی سے مقدم ہیں؛ کیونکہ ان کی امداد اور رضامندی کے

بغیر فعلِ زنا واقع ہی نہیں ہو سکتا، اس واسطے اسے پہلے لایا گیا۔“

”قرآن نے زنا کی مدد سزائیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ زانیوں کو ۱۰۰ کوٹے

مارے جائیں اور دوسری یہ کہ ان کا مقابلہ (بروئے آیت الزانی لا ینکم الا زانیۃ) کر دیا جائے۔ یعنی ان کو مومنین کی جماعت سے علیحدہ کر کے یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ توبہ کیے بغیر مومنین کے اندر نکاح کریں۔ ”قرآن میں دیگر احکام کی مو سے مومن کا شرک کے ساتھ نکاح جائز نہیں اور یہاں اس کے خلاف ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں شرک اللہ شرک اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں یعنی شرک وہ عبادت ہے جو اپنے خاند کے ساتھ کسی دوسرے کو حظ اٹھانے میں شریک کرے۔ اللہ شرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عورت کو حظ حاصل کرنے میں شریک کرے۔“

”پس زانیہ شرک کے معنی میں فرق ہے۔ شرک شوہر و زانیہ ہے اللہ زانیہ وہ مرد یا عورت ہے جو فعل زنا میں کسی دوسرے کی مدد کرے۔ اپنے آپ کو مفعول بنانے سے یا کسی دوسری طرح۔ اسی طرح زانی اللہ شرک میں فرق ہے۔ زانی عام ہے، خواہ اس کی بیوی ہو یا نہ ہو، اللہ شرک وہ زانی ہے جس کی بیوی ہو۔“ ”جو عالم صاحبان ہمارے اس قول کو نہیں مانتے وہ زانی کے لیے صرف ایک ہی سزا تجویز کریں گے، یعنی تلو کوڑے۔ دوسری سزا مقابلہ ان کے ہاں کوئی سزا نہ ہوگی۔“ ”ہاں ہے کہ یہ تلو کوڑے انتہائی سزا ہے۔ ہم نے اپنے معنوں (قرآن میں چور کی سزا) کے اندر لکھا تھا کہ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا انتہائی سزا ہے، کم سے کم سزائے کی قوت تیزی پر منحصر ہے۔“



کسی صورت میں حد سے بری نہیں ہو سکتا مگر چوتوہ کر کے حد سے  
 بری ہو سکتا ہے، بشرطیکہ قاضی قبول کر لے ؟

جواب :-

عنایت نامہ مع مضمون ”قرآن میں زنا کی سزا“ پنچا۔ آپ کے پہلے مضمون  
 اور اس دوسرے مضمون کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، راور  
 میری اس اظہار رائے پر آپ برا نہ مانیں، کہ آپ آیات قرآن کی تاویل و تفسیر اور  
 احکام شرعیہ کی تشریح میں وہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھتے جو ایک خدا ترس آدمی کو  
 ملحوظ رکھنی چاہیئے۔ اگر آپ میری نصیحت مانیں تو میں دوبار میں بطور اصول کے  
 آپ کو بتا دوں۔ ایک یہ کہ آپ بطور خود اپنے نظریات قائم کہہ کے قرآن و سنت  
 سے جو تعلیم ملے اس کے مطابق نظریات قائم کیا کریں۔ دوسرے یہ کہ قرآن و سنت  
 سے کسی مسئلے کا استنباط کرتے وقت ملعن کے مہتدین و مفسرین و محدثین کی تشریحات  
 کو سرے سے نظر انداز نہ کر دیا کریں۔ آپ کو اختیار ہے کہ ان میں سے ایک کی  
 رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے قبول کر لیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کا آپ  
 کے ساتھ رہنا اس سے بہتر ہے کہ آپ کے سب سے اگستقل مذہب بنائیں  
 تفرد صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ آپ قرآن و سنت کے گہرے  
 مطالعہ سے اعلیٰ درجے کی تحقیق و بصیرت بہم پہنچا چکے ہوں۔ (جس کی علامات  
 آپ کی تحریروں میں مجھے نظر نہیں آتیں) اور جس مسئلے میں بھی آپ اپنی متفرد  
 رائے ظاہر کریں اس میں آپ کے دلائل نہایت مضبوط ہوں۔ ان دو باتوں  
 کو اگر آپ ملحوظ رکھیں گے تو مجھے امید ہے کہ اُس طرح کی غلطیوں سے محفوظ

رہیں گے جو میں نے آپ کے مضامین میں پائی ہیں۔

میرے لیے آپ کے مضامین پر مفصل تنقید کرنا تو مشکل ہے، البتہ جو نمایاں غلطیاں بیک نظر دیکھ سکا ہوں انہیں بیان کیے دیتا ہوں۔

(۱) آپ کا یہ قول ایک حد تک صحیح ہے کہ قرآن میں چودہی ادد زنا کی جو سزا بیان کی گئی ہے وہ انتہائی سزا ہے، کم سے کم سزا جج کے اختیار تیزی پر موقوف ہے۔ لیکن اس سے بڑھی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ اس بات کی تصریح بھی ضروری ہے کہ جب زنا کے لیے وہ شہادت بہم پہنچ جائے جو شرعاً ضروری ہے، اور جب شرعی قواعد کے مطابق چودہی کا مجرم ثابت ہو جائے تو پھر چودہی ادد زنا کی وہی حد جاری کرنی پڑے گی جو قرآن میں مقرر کر دی گئی ہے۔ اس صورت میں حد سے کم سزا دینے کا جج کو اختیار نہیں۔ البتہ کترہ جہ کی چودہیاں کترہ جہ کی سزاؤں کے قابل ہوں گی، اور ثبوت زنا کے بغیر اگر کترہ جہ کی حد کے لواحق شہادت یا قرائن سے ثابت ہوں گے تو ان پر کترہ جہ کی سزاؤں کے قابل ہوں گی، اور ثبوت پر کترہ جہ کی سزائیں دی جاسکیں گی۔

(۲) آپ نے اپنے اس مضمون میں بھی اپنی غلطی غلطی کا اعادہ کیا ہے کہ الزانیۃ کے معنی ”مفعیل زنا کے مدحکار لوگ“ بیان کیے ہیں اور اس سے مراد ”دلائل“ و ”دلائل“ پیغام رساں اور زانی و زانیہ کے لیے آسانیاں بہم پہنچانے والے“ لیے ہیں۔ قرآن مرتب طور پر اس معنی سے ابا کرتا ہے۔ جس آیت میں زانی و زانیہ کی سزا بیان کی گئی ہے اس میں الزانی سے پہلے الزانیۃ کا ذکر ہے اور پھر دونوں کے لیے ایک ہی سزا مقرر کی گئی ہے کہ فاجلدوا کل واحد منهما

مائتہ جلدۃ (دونوں میں سے ہر ایک کو ستو کوڑے مارو)۔ لیکن آپ نے اس پر بھی اپنی رائے کو قرآن کے مطابق بدلنے کے بجائے قرآن کے حکم کو اپنی رائے کے مطابق بدلنے کی کوشش فرمائی۔ یہ بڑی بے جا جسارت ہے جس سے پرہیز واجب تھا۔

(۳) مشرک اور مشرک کے جو معنی آپ نے بیان کیے ہیں (یعنی مشرک وہ عودت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ دوسرے کو خطا ٹھانے میں شریک کرے اور مشرک وہ مرد ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر عودت کو خطا حاصل کرنے میں شریک کرے) یہ بالکل ہی ایک آزادانہ معنی آفرینی ہے جس کے لیے نہ لغت میں کوئی بنیاد پائی جاتی ہے نہ اصطلاح میں، اور نہ کوئی قرینہ ہی ایسا موجود ہے جس کی بنا پر ایسے دور از قیاس و گمان معنی لیے جاسکیں۔ آیت **الَّذَانِیْ لَا یُنِیْکُمُ اِلَّا کُرْہِیْنِ اَوْ مُشْرِکَۃٌ.....** الخ میں لا ینیکم سے مراد لا یلیق مبه ان ینیکم ہے۔ یعنی زانی ایک ایسا بدکار ہے کہ وہ کسی عقیفہ مومنہ سے نکاح کرنے کے لائق نہیں ہے، اس کے لیے اگر موند ہو سکتی ہے تو ایک بدکار یا مشرک عصمت ہی ہو سکتی ہے، اور زانیہ ایک ایسی فاسقہ و ناجوہ ہے کہ وہ کسی عصمت مومن کے لیے موندوں نہیں ہے، وہ اگر نکاح کے لائق ہے تو ایک بدکار یا مشرک مرد کے لیے ہو سکتی ہے۔ اس سے مقصود فعل زنا کی قباحیت و شاعت واضح کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ صالح اہل ایمان کو معروف بالزنا مردوں اور عورتوں سے مناکحت کے تعلقات نہ قائم کرنے چاہئیں۔

(۴) یہ ایک عجیب بات میں نے دیکھی کہ آپ خود تسلیم فرما رہے ہیں کہ خلفائے اربعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کی انتہائی حالتوں میں (زانی و مفسن) کی آپ تعزیر نہیں کرتے (مجرمین کو رجم کی سزا دی ہے مگر پھر بھی آپ یہ کہنے میں تامل نہیں کرتے کہ ”رجم آج کل کے تمدن کے خلاف ہے اللہ کوئی انسانی طبیعت رجم کو گوارا نہیں کر سکتی“ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ان الفاظ پر آپ خود اگر کبھی غور کریں گے تو آپ کو خراست محسوس ہوگی۔ کیا کوئی انسانی طبیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ پاکیزہ اور رحیم و شفیع ہو سکتی ہے؟ اللہ کیا ہم مسلمانوں کے لیے آج کل کا تمدن (ایم بی ڈی لائسنس!) کوئی معیارِ حق ہے؟

یہ چند معروضات میں صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ آپ نے خود مجھ کو اپنے مضامین پر تنقید کی دعوت دی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جب آغا بڑا دل رکھتے ہیں کہ تنقید کی خود دعوت دیتے ہیں تو آپ غور میری ان باتوں کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں گے اللہ اگر حق معلوم ہوں گی تو قبول کریں گے۔

ترجمان القرآن، ربیع الاول، ۱۴۰۳ھ، رجب الاخر، ۱۳۵۱ھ، جنوری، فروری، ۱۹۵۱ء

## دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت و مناکحت کے تعلقات

سوال ۱۰۔

الجہاد فی الاسلام کے دوران مطالعہ میں ایک آیت وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُحَاجِدُوا مَالَهُمْ مِنْ وَلَا يَتَّبِعُهُمْ مِنْ شَيْءٍ..... الخ نظر سے گزری۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ”اس آیت میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے پہلے مَالَهُمْ مِنْ وَلَا يَتَّبِعُهُمْ مِنْ شَيْءٍ سے یہ بتایا گیا ہے کہ ”جو مسلمان دارالکفر میں رہنا قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں ان سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی تعلقات نہیں رہ سکتے، نہ وہ باہم رشتہ قائم کر سکتے ہیں اور نہ انہیں ایک دوسرے کا جد و جہد و ترکہ مل سکتا ہے“ اب عرض یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان ”دارالکفر“ اور ”دارالاسلام“ کی وحدت میں دو ملک دھند میں آگئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت بھی اظہر من الشمس ہے۔ ان کی ذہنیتیں بھی بڑی حد تک بدل چکی ہیں بڑھیکہ ان سب لوازمات سے لیس ہو چکے ہیں جو ایک غلام قوم کے لیے از بس ضروری ہیں۔ بہتر سے رہنے پر مجبور ہیں اور بہت سے وہاں کی رہائش عمداً قبول کیے ہوئے ہیں۔ بعض ہجرت کر کے اپنے دین و ناموس کی حفاظت کی خاطر پاکستان چلے آئے ہیں۔ ان میں



اکثر ایسے بھی ہیں جن کے والدین ہندوستان ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں اور مرتے دم تک اس کو چھوڑنے پر تیار نہیں مگر اولاد پاکستان چلی آئی ہے اور اب ہندوستان کی سکونت اختیار کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں۔ انہیں حالات حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں :

- (۱) ایسی حالت میں اولاد، والدین یا کسی اور رشتہ دار کے چرہ دتر کہ سے محروم رہے گی؟ اگر وہ ان کے انتقال پر اپنے حق وراثت کا دعویٰ کریں تو کس حد تک یہ دعویٰ جائز یا ناجائز ہوگا؟
- (۲) موجودہ حالات کے پیش نظر کوئی پاکستانی (مہاجر یا اصل باشندہ) ہندوستانی مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟ کرنے کی صورت میں تعلقات جائز سمجھے جائیں گے یا ناجائز؟

جواب :-

جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں۔ رہا ان مہاجرین کا معاملہ جن کے ایسے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہیں جن کے وہ وراثت ہو سکتے ہیں تو ان کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ وہ ہندوستان میں اپنی میراث پا سکتے ہیں اور نہ ان کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان میں ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں۔ نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو نہیں ٹوٹ سکتا لیکن اگر مذہب میں سے ایک دارالاسلام

میں ہجرت کر آیا ہے اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی جاسکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔ آئندہ شادی بیاہ کا حلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیے۔  
(ترجمان القرآن - شعبان ۱۴۰۰ھ - جون ۱۹۵۱ء)

## کیا بالغ عورت خود اپنا نکاح کر لینے کی مجاز ہے ؟

سوال :-

علمائے اخلاف اور علمائے اہل حدیث کے درمیان نکاح بالغہ بلا ولی کے مسئلہ میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اخلاف اس کے قائل ہیں کہ بالغہ عورت اپنا نکاح اولیاء کے اذن کے بغیر یا ان کے خواہش کے علی الرغم جہاں چاہے کر سکتی ہے اور اس نکاح پر اولیاء کو اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اہل حدیث حضرات ایسے نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نکاح بلا ولی کی صحت میں جتنا دل دوسرا نکاح کیا جاسکتا ہے۔ فریقین کے دلائل، جہاں تک میرے سامنے ہیں، مختصراً پیش کرتا ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ اس بارے میں اپنی تحقیق واضح فرمائیں :-

جواب :-

اس سوال کے ساتھ سائل نے پوری تفصیل کے ساتھ فریقین کے دلائل جمع

رو دیئے ہیں، لہذا پہلے ہم ان دلائل کو یہاں نقل کر رہے ہیں :

(۱) حنفیہ کا استدلال حسب ذیل آیات اور احادیث سے ہے :

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَنكُم مَّيذُونٌ أِذَا جِئْتُم بِأَنفُسِكُمْ  
أَرْبَعَةً أَشْهُدَ وَعَشْرًا جِئْتُمْ بِثَلَاثٍ فَلَئِنَّ أَكْثَرَكُم  
لَا تَعْلَمُونَ (البقرہ ۲۹)

تم میں سے جو لوگ مجھ میں سے ہیں اور جو یہاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنے آپ کو چار  
مہینے حسن و قبح کے کسی پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو جو کچھ وہ اپنی ذات کے  
معامے میں معروف طریقے سے کریں، اس کا تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَسْكُنَ مَنكُم رُجُوعًا غَيْرَ.....  
(البقرہ ۲۹)

پھر اگر (تیسری بار) شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی، تو وہ عورت اس کے لیے  
حلال نہ ہوگی الا یہ کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

... فَلَا تَنْصَلُّوْهُنَّ اِنْ تَبَكَّنَّ اِذْ وَاَجَعْنَ اِذَا قَرَأْتُمْ اَبْدِيَهُمْ  
بِالْمَعْرُوفِ ط  
(البقرہ ۳۰)

.... پھر تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو کہ وہ اپنے زیرِ تحویز شوہروں سے  
نکاح کر لیں جبکہ وہ بچے طریقے سے باہم رضا مند ہو جائیں۔

عن نافع ابن جبیر عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه  
وسلم الايم الحق بنفسها من وليها وبكوتها واذنها سكوتها

وفي رواية الثيب احق بنفسها من وليها - (نصب الواية ج ۲ ص ۱۸۲)  
 نافع ابن حبيب نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے فرمایا کہ جو عورت اپنے ولی سے زیادہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی حق دار  
 ہے، اور کنواری کا مشورہ لیا جانا چاہیے۔ اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے  
 اور ایک روایت میں ہے کہ شوہر ویدہ عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنے نکاح  
 کے معاملے میں حق دار ہے۔

عن ابی سلمة ابن عبد الرحمن قال جاءت امرأة الى رسول الله صلى  
 الله عليه وسلم فقالت ان ابی انکحنی رجلا وانا کارهة فقال رسول  
 الله صلى الله عليه وسلم لا بیعا لا نکاح لک، اذھی فانکحی من شئت.  
 (ایضاً)

ابی سلمہ ابن عبد الرحمن سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا میرے باپ نے میرا نکاح ایک مرد سے  
 کر دیا ہے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں۔ آپ نے باپ سے فرمایا کہ نکاح کا  
 اختیار تمہیں نہیں ہے اور نہ کسی سے فرمایا جاؤ جس سے تمہارا جی چاہے نکاح کر لو۔

عن عبد الرحمن بن القاسم روى من طريق مالك عن ابيه عن  
 عائشة انها زوجت حفصة بنت عبد الرحمن من المنذر  
 ابن زبیر وعبد الرحمن غائب بالشام۔ فلما قدم عبد الرحمن قال و  
 مثل نكحات عليه ؟ فكلمت عائشة المنذر ابن زبیر فقال  
 ان ذلك بيد عبد الرحمن۔ فقال عبد الرحمن ما كنت لأرد أمراً

فَضِيَّتْهُ فَاسْتَقَرَّتْ حَفْصَةُ عِنْدَ الْمُثَدَّرِ وَلَمْ يَكُنْ ذَاكَ طَلَاقًا -  
(اَيْضًا)

ہلک نے عبد الرحمن سے انہوں نے اپنے باپ سے، اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے حفصہ بنت عبد الرحمن کا مندر ابن زبیر سے نکاح کر دیا۔ اس وقت عبد الرحمن شام میں تھے۔ جب وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ کیا میری رائے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ تب حضرت عائشہ نے مندر ابن زبیر سے بات کی۔ انہوں نے کہا کہ فیصلہ عبد الرحمن کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر عبد الرحمن نے حضرت عائشہ سے کہا کہ جس معاملے کو آپ نے طے کر دیا ہے، میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا چنانچہ حفصہ مندر کے پاس ہی رہیں اور یہ طلاق نہ تھی۔

اُخْرِجَ الْبُودَازُ وَالنِّسَاءُ ..... عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ لِلنِّسَاءِ مَعِ التَّيْبِ أَمْرٌ. (اَيْضًا)  
ابو داؤد اور نسائی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شوہر ویدہ عورت پر ولی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے  
اُخْرِجَ النِّسَاءُ وَاحْمَدُ ..... عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ فَتَاةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ ابْنَةَ زَوْجِي ابْنِ أَخِيهِ لَيَرْفَعُنِي مِنْ خُسَيْتِهِ قَالَ فَجَعَلَ الْأُمُورَ لَهَا فَعَالَتْ أَنِي قَدْ اجْزَتْ مَا صَنَعْتُ ابْنِي، وَلَكِنْ ارْجِعِي ابْنَهُ تَعْلَمُ النِّسَاءُ أَنَّ لَيْسَ لِلنِّسَاءِ مَعِ الْأُمُورِ شَيْءٌ -  
نسائی اور احمد نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ ایک لڑکی بنی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! میرے  
 باپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ میرا بیاد صرف اس لیے کر دیا ہے کہ میرے ذریعے سے  
 اُسے زنت سے نکالے۔ آپ نے نکاح (کی فسخ و استقرار) کا حق لڑکی کو دے  
 دیا۔ لڑکی نے کہا، میرے والد نے جو کچھ کیا ہے میں اُسے حائل قرار دیتی ہوں، میری خواہش  
 صرف یہ تھی کہ عورتیں جان لیں کہ باپوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے  
 (۲) اہل حدیث حضرات اپنی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث پیش کرتے

ہیں:

عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 ایما امرأتہ نکحت بغیر اذن و بیہا فنکاحھا باطل..... فان  
 اشتجروا فالسلطان دلی من لا ولی لھا۔ (بلوغ النواہ)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو عورت بھی اپنے  
 ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اُس کا نکاح باطل ہے..... پس اگر جھگڑا ہو تو  
 جس عورت کا ولی نہ ہو تو سلطان اس کا ولی ہے۔

عن ابی موسیٰ عن امیہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا  
 نکاح الا بالولی (و ایضا)  
 ابو موسیٰ اپنے والد سے رفا کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 فرمایا، ”ولی کے بغیر نکاح نہیں جائز نہیں ہے۔“

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تزوج  
 المرأة ولا تزوج المرأة نفسها۔ (مسند بیہقی)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دوسری عورت کی (ولی بن کر) نکاح کرے، اور نہ کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔

قال عمر ابن الخطاب ایہا امراؤ لا تعینیکمھا الولی و الاولاد فانکحھا

باطل۔ (ایضاً)

حضرت عمرؓ نے فرمایا جس عورت کا نکاح ولی یا حکام نہ کریں اس کا نکاح باطل

ہے۔

عن عکرمۃ ابن خالد قال جعلت امراؤ لا یتب امراھا بید رجل غیر ولی فانکحھا قبلہم ذالک عمر فجدلنا کم و بالسنکھ و رد فکاحھا۔

(ایضاً)

عمرؓ ابن خالد سے روایت ہے کہ ایک شوہر ویدہ عورت نے اپنا معاملہ ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا جو اس کا ولی نہ تھا اور اُس شخص نے عورت کا نکاح کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے نکاح کرنے اور کرانے والوں کو اسے زادی اور نکاح منسوخ کر دیا۔

عن علی قال ایہا امراؤ لا تکبت بغیر اذن ولیہا فانکحھا باطل لانکاح الا باذن ولی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا جس عورت نے بھی اپنے ولی کے اذن کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے۔ بلا اجازت ولی کوئی نکاح نہیں۔  
عن الشعبی ان عمرو علیاً رضی اللہ عنہما وشریحنا و مسروقاً

رحمہما اللہ قالوا لانکاح الابولی (ایضاً)

اہم شعی سے روایت ہے کہ حضرت علیؑ حضرت عمرؓ، شرعاً اللہ مردقہ نے فرمایا کہ بدل کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہے۔

ان دلائل پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دونوں طرف کافی فتن ہے اللہ کہنے کی معنی نش نہیں ہے کہ فریقین میں سے کسی کا مسلک بالکل غلط ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شارع نے فی الواقع رد متضاد حکم دیئے ہیں؟ یا ایک حکم کو دوسرا حکم منسوخ کرتا ہے؟ یا دونوں حکموں کو طاکہ شارع کا انشاء ٹھیک طود پر متحقق ہو سکتا ہے؟ پہلی شق تو مرکباً باطل ہے۔ کیونکہ شریعت کا پورا نظام شارع کی حکمت کا مادہ پر دلالت کر رہا ہے اللہ حکیم سے متضاد احکام کا صدور ممکن نہیں ہے۔ دوسری شق بھی باطل ہے کیونکہ نسخ کا کوئی ثبوت یا قرینہ موجود نہیں ہے۔ اب صرف تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اللہ ہیں اسی کی تحقیق کرنی چاہیے۔

۱۔ نکاح کے معاملے میں اصل فریقین مرد اللہ عودت ہیں نہ کہ مرد اور اولیا۔ اسی بنا پر ایجاب و قبول ناکح اللہ مشکوٰۃ کے وہ میان ہوتا ہے۔

۲۔ بالغ عودت رہا کہ ہو یا قبیح، کانکاح اس کی رضا مندی کے بغیر یا اس کی مرضی کے خلاف منعقد نہیں ہو سکتا، خواہ وہ نکاح کرنے والا باپ ہی کیوں نہ ہو۔



جس نکاح میں عورت کی طرف سے رضاد ہو، اس میں برے سے ایجاب ہی موجود نہیں ہوتا کہ ایسا نکاح منعقد ہو سکے۔

۳۔ مگر شارع اس کو بھی جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنے نکاح کے معاملے میں بالکل ہی خود مختار ہو جائیں، اور جس قسم کے مرد کو چاہیں اپنے اولیاء کی مرضی کے خلاف اپنے خاندان میں داماد کی حیثیت سے گھس لائیں۔ اس لیے جہاں تک عورت کا تعلق ہے شارع نے اُس کے نکاح کے لیے اس کی اپنی مرضی کے ساتھ اس کے ولی کی مرضی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ نہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جہاں چاہے اپنا نکاح کر لے، اور نہ ولی کے لیے جائز ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح جہاں چاہے کر دے۔

۴۔ اگر کوئی ولی کسی عورت کا نکاح بطور خود کر دے تو وہ عورت کی مرضی پر معتد ہوگا، وہ منظور کرے تو نکاح قائم رہے گا، نامتصور کرے تو معاملہ عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ یہ نکاح عورت کو منظور ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عورت کو نکاح نامتصور ہے تو عدالت اسے باطل قرار دے گی۔

۵۔ اگر کوئی عورت اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کر لے تو اس کا نکاح ولی کی اجازت پر معتد ہوگا۔ ولی منظور کرے تو نکاح برقرار رہے گا، نامتصور کرے تو یہ معاملہ بھی عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ ولی کے اعتراض و انکار کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ فی الواقع معقول وجوہ کی بنا پر اس مرد کے ساتھ اپنے گھر کی لڑکی کا جوڑ پسند نہیں کرتا تو یہ نکاح فسخ کیا جائے گا اور اگر یہ ثابت

ہو جائے کہ اس عورت کا نکاح کرنے میں اس کا ولی دانستہ تساہل کرتا رہا، یا کسی ناجائز غرض سے اس کو نکاح کر لیا اور عورت نے غمگ آکر اپنا نکاح خود کر لیا تو پھر ایسے ولی کو سنی الاعتیار ٹھیرا دیا جائے گا اور نکاح کو عدالت کی سند جو لازم دے دی جائے گی۔ **ہذا ماعندی والله اعلم بالصواب۔**

## شادی بیاہ میں کفارت کا لحاظ

سوال ۱۱۔

ترجمان القرآن بابت ذی القعدہ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ میں آپ نے مولانا ظفر احمد صاحب ثنائی کے جواب میں ایک جگہ ایسے تسامح سے کام لیا ہے جو ناقابل برداشت ہے۔ مولانا موصوف نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ ”کیا ایک سید ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے سید نہ رہے گا بلکہ جلاہ بن جائے گا؟“ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آپ نے بھی جواب میں دہلی نہ ہاں سے اس غیر اسلامی امتیاز کو یہ کہہ کر تسلیم کر لیا کہ ”دار الکفر کے ایک سید صاحب دارالاسلام کی ایک سیدائی کے ہاتھ پر نسب کفو ہی سہی“ آپ کے الفاظ مبہم ہیں۔ کیا آپ بھی مسئلہ کفو کو اسلام میں جائز سمجھتے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آپ قرآن و حدیث سے استشہاد پیش فرما کر میرا اطمینان فرمائیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ دنیا کے کام کاج اور پیشوں کو انسانیت کی ادنیٰ نیچ میں کیوں دخل ہو؟

بنی نوع انسان سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے اگر لوہے کا کام کیا ہے تو وہ لوہا رٹھریا گئے؟

جواب :۔

آپ نے کفارت کے مسئلے پر جو اعتراض کیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ طرزِ تعبیر میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن نفسِ مسئلہ کفارت تو عقل اور نقل دونوں سے ثابت ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر، بھائے خود نکاح میں اُس کے معتبر ہونے پر اللہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

اس مسئلے کا مأخذ متعدد احادیث ہیں۔ مثلاً :

لا تَنْكِحُوا النِّسَاءَ إِلَّا الْكَفَّاءَ۔  
(دارقطنی، بیہقی)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ أَتَيْنَ كَامٍ مِنْ جَنِّ كَو  
الْعَوْنَةُ إِذَا اتَتْ وَالْبَنَازَةُ

اِذَا حَضَرَتْ وَلِلَّامِ إِذَا  
وَجَدَتْ كَفَاءً۔

(ترمذی، حاتم)

تَخَيَّرُوا لِنَفْسِكُمْ وَأَنْكِحُوا  
كُفَاءً

اپنی نفس پیدا کرنے کے لیے  
اچھی عورتیں تلاش کرو اور  
اپنی عورتوں کے نکاح ایسے

نکاح کے لئے مرد و عورت کے کفو

میں۔

(یہ حدیث حضرت عائشہؓ، انسؓ، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم سے منقول ہے)

مطلوبہ ہے مردی ہے)

لَا مَنَعَن لِمَرْدٍ ذَوَامَتِ  
الْأَحْسَابِ إِلَّا مِنَ الْكَفَّارِ۔

میں شریعت گھرانوں کی عورتوں کے  
نکاح کفو کے سوا کہیں اور نہ کرنے

میں لگا۔

یہ تو ہے اس مسئلے کی نقلی دلیل۔ رہی عقلی دلیل، تو عقل کا مرتبہ تقاضا یہ ہے کہ کسی لڑکی کو کسی شخص کے نکاح میں دیتے وقت یہ دیکھا جائے کہ وہ شخص اس کے جوڑ کا ہے یا نہیں۔ اگر جوڑ کا نہ ہو تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان دونوں کا نباہ ہو سکے گا۔ نکاح سے مقصود تو عقلاً بھی اور نقلاً بھی یہی ہے کہ زوجین کے درمیان مودت و محبت ہو اور وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کر سکیں۔ آپ خود سوچ لیں کہ بے جوڑ نکاحوں سے اس مقصود کے حاصل ہونے کی کہاں تک توقع کی جاسکتی ہے؟ اور کونسا مقول انسان ایسا ہے جو اپنے لڑکے یا لڑکی کا بیاہ کرنے میں جوڑ کا لحاظ نہ کرتا ہو؟ کیا آپ اسلامی مساوات کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مرد کا ہر عورت سے اور ہر عورت کا ہر مرد سے صرف اس بنا پر نکاح کر دیا جائے کہ دونوں مسلمان ہیں، بلا اس لحاظ کے کہ ان میں کوئی خاصیت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ فقہاء نے اس جوڑ کا مفہوم مشخص کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک

نے اپنے اپنے طریقے پر یہ بتایا ہے کہ ٹرکی ادھر ٹر کے کے درمیان کن کن امور میں مماثلت ہونی چاہیئے۔ ہم ان تفصیلات میں بعض فقہاء سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کر سکتے ہیں۔ مگر فی الجملہ عقل عام یہ تقاضا کرتی ہے کہ زندگی بھر کی شرکت و رفاقت کے لیے جن دوستیوں کا ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے ان کے درمیان اخلاق، دین، خاندان، معاشرتی طوور طریق، معاشرتی عزت و حیثیت، مالی حالات، ساری ہی چیزوں کی مماثلت دیکھی جانی چاہیئے۔ ان امور میں اگر پوری یکسانی نہ ہو تو کم از کم اتنا تفاوت بھی نہ ہو کہ زوجین اُس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور رفاقت نہ کر سکیں۔ یہ انسانی معاشرت کا ایک عملی مسئلہ ہے جس میں حکمتِ علی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آدم کی ساری اولاد کے یکساں ہونے کا نظریہ آپ یہاں چلانا چاہیں گے تو لاکھوں گھر برباد کر دیں گے۔ ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ بعض سلسل و نسب کی بنا پر ذات بات اور اونچ نیچ کا تصور ایک جاہلی تصور ہے، تو اس بات میں یقیناً میں آپ سے اتفاق کر دوں گا۔ جن لوگوں نے کفارت کے لغوی مسئلے کو مسخ کرنے کے ہندوؤں کی طرح کچھ اور اپنی اور کچھ نبی ذاتیں قرار دے رکھی ہیں ان پر مجھے بھی دلایا ہی اعتراض ہے جیسا آپ کو ہے۔

(ترجمان القرآن - ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ - ستمبر ۱۹۵۲ء)

## نکاحِ شغار

سوال ۱۔

مسلمانوں میں عموماً رواج ہو گیا ہے کہ دو شخص باہم لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی اول بدل کے اصول پر کرتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی اشخاص مل کر اس طرح کا اول بدل کرتے ہیں۔ مثلاً زید بکر کے لڑکے کے ساتھ، بکر عمر کے لڑکے کے ساتھ، عمر زید کے لڑکے کے ساتھ اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔ ان صورتوں میں عموماً ہر کی ایک ہی مقدار ہوتی ہے۔ بعض ملائے دین اس طریقہ کو شغار کہتے ہیں اللہ بتایا جاتا ہے کہ شغار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

محالات موجودہ ایک غریب آدمی یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے، کیونکہ جس آسانی سے دوسرے لوگ اس کی لڑکی کو قبول کر لے پر تیار ہوتے ہیں اس آسانی سے اس کے لڑکے کو رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتے۔

براہِ کرم اس مسئلہ کی حقیقت واضح فرمائیں۔

جواب ۱۔

عام طور پر آدمے بدلے کے نکاح کا جو طریقہ ہمارے ملک میں رائج ہے وہ دراصل اسی شغار کی تعریف میں آتا ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

منع فرمایا ہے۔ شفا کی تین صورتیں ہیں اور وہ سب ناجائز ہیں۔  
ایک یہ کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس شرط پر اپنی لڑکی دے کہ وہ اس  
کو بدلے میں اپنی لڑکی دے گا اور ان میں سے ہر ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر  
قرار پائے۔

دوسرے یہ کہ شرط تو وہی آوے بدلے بدلے کی ہو مگر دونوں کے برابر برابر مہر  
مثلاً ۵۰، ۵۰ ہزار روپیہ) مقرر کیے جائیں اور بعض فرضی طور پر فریقین میں ان  
ساوی رقموں کا تبادلہ کر لیا جائے۔ دونوں لڑکیوں کو عطا ایک پیسہ بھی نہ ملے۔  
تیسرے یہ کہ آوے بدلے کا معاملہ فریقین میں صرف زبانی طور پر ہی طے نہ ہو  
بلکہ ایک لڑکی کے نکاح میں دوسری لڑکی کا نکاح شرط کے طوع پر شامل ہو۔  
ان تینوں صورتوں میں سے جو بھی صورت اختیار کی جائے گی، شریعت کے  
خلاف ہوگی۔ پہلی صورت کے ناجائز ہونے پر تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ البتہ  
باقی دو صورتوں کے معاملہ میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ لیکن نئے دلائل شرعیہ کی  
بنیاد پر یہ اطمینان حاصل ہے کہ یہ تینوں صورتیں شفا پر منوع کی تعریف میں آتی ہیں اور  
تینوں صورتوں میں اُس معاشرتی فساد کے اسباب یکساں طور پر موجود ہیں جن کی  
وجہ سے شفا کو منع کیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن و حجب شعبان ۱۳۴۵ھ - اپریل، مئی ۱۹۵۲ء)

## منگنی کا شرعی حکم

سوال ۱۔

کیا شرعی لحاظ سے خطبہ نکاح کا حکم رکھتا ہے؟ علوم اس کو ایجاب قبول کا درجہ دیتے ہیں۔ اگر لڑکی کے والدین شہری ہوئی بات کو رد کر دیا تو ہمدی میں ان کا مقابلہ تک ہو جاتا ہے۔ اس صدمت میں اگر والدین اس لڑکی کا نکاح دوسری جگہ کر دیں تو کیا یہ فعل درست ہوگا؟

جواب ۱۔

منگنی محض ایک قول و قرار ہے اس بات کا کہ آئندہ اس لڑکی کا نکاح فلاں شخص سے کیا جائے گا۔ یہ بچائے خود نکاح نہیں ہے۔ البتہ فریقین کے درمیان ایک طرح کا عہد و پیمان ضرور ہے جس سے پھر جانا درست نہیں، الا یہ کہ اس کے لیے کوئی معقول وجہ موجود ہو۔ اگر منگنی کے بعد فریقین میں سے کسی ایک پر دوسرے کا کوئی ایسا عیب ظاہر ہو جو پہلے معلوم یا چھپا یا گیا تھا، تو بلاشبہ اس قول و قرار کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس طرح کی کسی معقول وجہ کے بغیر یونہی اسے ختم کر دینا، یا کسی غیر معقول وجہ کی بنا پر اس سے پھر جانا ہرگز جائز نہیں۔ دوسری بدعہد لیل کی طرح یہ بھی ایک بدعہدی ہے جس پر انسان خدا کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

(ترجمان القرآن محرم، صفر ۱۳۶۲ھ۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)



## کیا برقع پردے کا مقصد لوہا کرتا ہے ؟

سوال ۱۔

احقر ایک مدت سے فرہنی ادنیٰ طبقہ پر آپ کی تحریک آہستہ  
دین سے وابستہ ہے۔ پردہ کے مسئلہ پر آپ کے افکار عالیہ پڑھ کر  
بہت خوشی ہوئی۔ لیکن آخر میں آپ نے مرد و عورت کو بھی (Dress)  
کیا ہے۔ اس کے متعلق دو ایک باتیں دل میں کھینچی ہیں۔ بڑا و جہرانی  
ان پر روشنی ڈال کر شکور فرمائیں۔

پردے کی غایت منفی میلان کی انتشار پسندی کو روکنا ہے۔ ظاہر  
ہے کہ یہ میلان ہر دو اصناف میں پایا جاتا ہے (مرد و عورتوں میں فرق کی  
فوجیت سے انکار نہیں)۔ اسی وجہ سے پردے کی اصل روح —  
— غصہ بھر کا حکم مرد و عورت دونوں کے لیے ہے۔ لیکن یہ حقیقت  
ہے کہ برقع کی "دیوار" کے پیچھے عورتوں کی بہت بڑی اکثریت "نگاہ  
کے زنا" کی ترغیب ہوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ ان کا یہ اطمینان  
(Satisfaction) ہوتا ہے کہ ہم تو مردوں کو دیکھ رہی ہیں لیکن  
مرد ہمیں نہیں دیکھ رہے، اور نہ ہماری اس نظارہ بازی کا علم ہی کسی  
کو ہے۔ سو اس طرح کی خواتین میں جو ہر حیا — منفی نازک کا  
اصل جوہر — بہت کم پایا جاتا ہے۔

غلام انیس برقع اور کر ایک اوسط معاشی وسائل کے کنبہ کی

عورتیں اپنے کام کاج بھی کماحقہ انجام نہیں دے سکتیں۔ سفر ہی کو لیجئے، گاڑیوں اور بسوں وغیرہ میں مڑھنا امداد تاہر قع پوش عورت کے لیے خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔

پردہ — ”مکمل پردہ“ — کی اہمیت و عقلیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ مرد و عورت کے بجائے الگ الگ کوئی مندرجہ ذیل طریقہ استعمال ہو۔ مثال کے طور پر آج سے چند سال پیشتر تک دیہات کی شریف عورتیں خود کو ایک چادر میں مستور کرتی تھیں۔ چادر میں وہ یہ جرات نہ کر سکتی تھیں کہ کسی مرد کو مسلسل دیکھیں اور ان کی آنکھوں میں شرم و حیا کا بہت اعلیٰ مظاہرہ ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ برقع کی نسبت اس چادر میں بہت اچھی طرح ”پردہ“ ہوتا تھا۔

آپ کی ضروریات کے علم کے باوجود آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

جواب :۔

آپ نے اپنے سوال میں کئی چیزوں کو غلط کر دیا ہے۔ بہتر ہو کہ ایک ایک چیز کو آپ الگ الگ لیں اور پھر اس پر غور کر کے رائے قائم کریں۔

پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ کیا غصہ بھر کی تعین اور اخلاقی تربیت کے بغیر یہ ممکن ہے کہ کوئی عورت کسی طیر مرد کو گھورنے سے روکی جاسکے؟ آپ برقع کی نقاب پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ صرف مرد کو عورت پر نگاہ ڈالنے سے روکتی ہے، عورت کو اس ناجائز نظر بازی سے نہیں روکتی۔ مگر یہ عیب تو صرف نقاب میں نہیں ہے، چادر میں بھی ہے۔ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ

محبت چادر سے منہ ڈھاگ کر جب باہر نکلے تو اسے راستہ دیکھنے کے لیے کم از کم اتنی جگہ کھلی رکھنی چاہیے کہ اس کی آنکھ سامنے دیکھ سکے۔ پھر یہ عیب چلن میں بھی ہے جو آپ مردانوں اور کھڑکیوں پر ڈالتے ہیں۔ بلکہ یہ عیب ہر اس چیز میں ہے جس سے کوئی عورت باہر جھاگ سکتی ہو۔ آپ خود بتائیں کہ ان منافق کو آپ کیسے روک سکتے ہیں؟ اور کیا فی الواقع شریعت کا بھی یہ مطالبہ ہے کہ ان سب منافق کو روکا جائے؟ علاوہ بریں اسی کتاب پر ردہ میں میں نے وہ روایت نقل کی ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو حبشیوں کے کھیل کود کا تماشہ دکھایا تھا۔ وہاں میں لے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مردوں کا عورتوں کو دیکھنا اور عورتوں کا مردوں کو دیکھنا نہ شرعاً بالکل یکساں ہے اور نہ نفسیات کے اعتبار سے ان کی حیثیت برابر ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر برقع بجائے خود بھڑکیا اور جاذب نظر نہ ہو، سادہ اور بے زینت ہو تو شرعاً اس پر کس اعتراض کی گنجائش ہے؟ کیا وہ شریعت کے کسی مطالبہ کو پورا نہیں کرتا؟ اگر کرتا ہے تو ہمارے پاس اس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے نزدیک کوئی دوسری چیز اس سے بہتر طریقہ پر شریعت کے منشا کو پورا کرتی ہو۔ ایسی کوئی چیز آپ کی نگاہ میں ہے تو آپ اسے تجویز کر سکتے ہیں مگر برقع کو ناجائز کہنا کسی طرح درست نہیں۔

برقع اللہ کے چلنے پھرنے اور لمبوں وغیرہ پر چڑھنے کے سلسلے میں

آپ جو مشکلات بیان کرتے ہیں وہ جواز و عدم جواز کی بحث سے غیر متعلق ہیں۔ آپ کے نزدیک چادر میں اس سے کم مشکلات ہیں یا کسی قسم کی مشکلات نہیں ہیں تو خواتین کو اس کی طرف توجہ دلائیں۔ وہ تجربہ سے اُسے مناسب تر پائیں گی تو کیوں نہ اختیار کریں گی۔

(ترجمان القرآن شعبان ۱۳۶۰ھ - مطابق جون ۱۹۵۱ء)

## عورت اور سفر حج

سوال ۱۔

عورت کے محرم کے بغیر حج پر جانے کے بارے میں علمائے کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ براہ کرم مختلف مذاہب کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کے نزدیک قابل ترجیح مسلک کون سا ہے ؟

جواب ۱۔

عورت کے بلا محرم حج کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس معاملہ میں چار مسلک پائے جاتے ہیں جنہیں مختصراً یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔  
(۱) عورت کو کسی حال میں شوہر یا محرم کے بغیر حج نہ کرنا چاہیئے۔  
۲ مسلک ابراہیم نخعی، شعبی اور حسن بصری رحمہم اللہ سے منقول ہے اور حنبلی مذاہب کا یہی فتویٰ ہے۔

(۲) اگر حج کا سفر تین شبانہ روز سے کم کا ہو تو عورت بلا محرم جاسکتی ہے، لیکن اگر تین دن یا اس سے زائد کا سفر ہو تو شوہر یا محرم کے بغیر نہیں جاسکتی۔ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کا یہی مذہب ہے۔

(۳) جو عورت شوہر یا محرم نہ رکھتی ہو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ جا سکتی ہے جن کی اخلاقی حالت قابلِ اطمینان ہو۔ یہ ابنِ سیرینؒ، عطاء، زہریؒ، قتادہ اور اذاعی رحمہم اللہ کا مسلک ہے اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام شافعیؒ نے ”قابلِ اطمینان دلیقوں“ کی مزید تشریح اس طرح کی ہے کہ اگر چند عورتیں بھروسے کے قابل ہوں اور وہ اپنے محرموں کے ساتھ جا رہی ہوں تو ایک بے شوہر اور بے محرم عورت ان کے ساتھ جاسکتی ہے۔ البتہ صرف ایک عورت کے ساتھ اُسے نہ جانا چاہیئے۔

(۴) ان سب کے خوف ابنِ حزمؒ ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ بے محرم عورت کو تنہا ہی حج کے لیے جانا چاہیئے۔ اگر وہ شوہر رکھتی ہو اور وہ اُسے نہ لے جائے تو شوہر گنہ گار ہو گا مگر عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے بغیر حج کو چلی جائے۔

میں ان چاروں مالک میں سے تیسرے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس میں ایک دینی فریضہ کو ادا کرنے کی گنجائش بھی ہے، اور اُس فتنے کا احتمال بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث میں عورت کے بلا محرم سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۴۷۱ھ - ستمبر ۱۹۵۲ء)

## دراشت میں اخیانی بھائی بہنوں کا حصہ

سوال :-

قدوسی (کتاب الفرائض، باب المحجب) میں یہ عبارت درج ہے  
 ان متروک الموات زوجا واما اوجدة واخوتہ من امر واخلأ  
 من اب وام فلزوج النصف وللأم السدس وللاولاد الاثر  
 الثلث ولاشیئ لاختہ للاب والام۔ یعنی اگر ایک عورت  
 کے وارثوں میں اُس کا شوہر، ام یا دادی اور اخیانی (ماں شریک) بھائی  
 اور سگ بھائی موجود ہیں تو شوہر کو آدھا حصہ، ماں کو چھٹا حصہ اور اخیانی  
 بھائی بہنوں کو ایک تہائی حصہ ملے گا اور سگے بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔

مدیانت طلب امر ہے کہ کیا یہ اخلاف کا مفتی ہے؟ کیا یہ قرین  
 انصاف ہے کہ بڑا مدہ حقیقی تو محروم ہو جائے اور اخیانی (یعنی ماں جائے)  
 بھائی بہن چھوڑے، تو حضرات کی قانونی تعریف بھی واضح فرمائیں۔ کیا والدہ  
 اور دادی کے زعم ہونے کے باوجود ایک میت کو کلامہ قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب :-

قدوسی سے جو مسئلہ آپ نے نقل کیا ہے، اس میں سلف کے مابین اختلاف  
 ہے۔ اگر کوئی عدالت مرجعہ اے اور مجھے شوہر، ماں سگے بھائی بہن اور اخیانی  
 زینتی ماں جائے، بھائی بہن چھوڑے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابو موسیٰ اشعری اور ابی ابن

کعب رضی اللہ عنہم کا فتویٰ یہ ہے کہ اُس کی نصف میراث شوہر کو، پُر ماں کو اور  
 پُر اخیانی بھائی بہنوں کو دیا جائے گا اور سگے بھائی بہنوں کو کچھ نہ ملے گا۔ اسی  
 فتویٰ کو ملائے اخلاف نے لیا ہے اور یہی ان کا مفتی بہ قول ہے۔ بخلاف اس  
 کے حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کا یہ مذہب ہے کہ پُر میراث سگے  
 اور اخیانی بھائی بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی جائے گی۔ حضرت عمرؓ پہلے قول اول  
 کے قائل تھے مگر بعد میں انہوں نے قول ثانی اختیار کر لیا۔ ابن عباسؓ سے دور روٹ گیا  
 مروی ہیں مگر زیادہ معتبر روایت یہی ہے کہ وہ بھی قول ثانی کے قائل تھے۔ اسی  
 پر قاضی شریک نے فیصلہ کیا ہے اور امام شافعیؒ اہم مالک اور سفیان ثوری رحمہم  
 اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ اخیانی بھائی بہن ذوی  
 الفروض میں اور سگے بھائی عصبات میں، اور ذوی الفروض کا حق عصبات پر مقدم  
 ہے، لہذا جب ذوی الفروض سے کچھ نہ بچے تو عصبات کو کوئی حق نہ پہنچے گا۔  
 دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ ماں جائے ہوئے میں جب سگے اور  
 اخیانی بھائی بہن یکساں میں تو کوئی توجہ نہیں کہ وہ برابر نہ کے حصے دار نہ ہوں۔  
 کلام کے جو معنی حضرت ابو بکرؓ نے بیان فرمائے ہیں اور جنہیں حضرت عمرؓ  
 نے بھی قبول کیے ہیں، من لا ولد له ولا والد۔ یعنی کلام وہ ہے جس  
 کی اولاد ہو اور نہ باپ۔ اسی طرح ماں یا دادی کی موجودگی کسی میت کے کلام  
 ہونے میں مانع نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن - ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ - ستمبر ۱۹۵۲ء)

## محرمات کی حرمت کے وجوہ

سوال :-

چند روز سے رفقاء کے درمیان محرمات کے سلسلے میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے جو میں ذیل میں تحریر کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ازراہ کرم اس پر روشنی ڈال کر شکور فرمائیں گے۔

مناکحت کے سلسلے میں ایک عورت اور دوسری عورت میں کیوں تیانہ کیا گیا ہے کہ بعض کو عقد میں لایا جاسکتا ہے اور بعض محرمات کی فہرست میں آتی ہیں؟ اگرچہ ابتدائے انسانیت میں ایسی کوئی قید نظر نہیں آتی ہے جیسا کہ باہلی اور قایل کے قصے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ کیا اس قسم کی شادیاں حیاتیاتی مفاسد کا موجب بھی بن سکتی ہیں؟

امید ہے کہ آپ اس کا جواب ترجمان القرآن میں شائع فرمادیں گے تاکہ دیگر حضرات کے لیے بھی استفادہ کا باعث ہو۔

جواب :-

محرمات کی فہرست میں جن عورتیں کو شامل کیا گیا ہے، ان کے حرام ہونے کی ہونے کی اصل وجہ حیاتیاتی حقائق نہیں ہیں بلکہ اخلاقی اور معاشرتی حقائق ہیں۔ آپ خود غور کریں کہ جس ماں کے شہوانی جذبات بھی اپنے بیٹے سے متعلق ہو سکتے ہوں کیا وہ اُن پاکیزہ و مسلمہ جذبات کے ساتھ بیٹے کو پال سکتی ہے جو ماں اور بیٹے کے تعلقات میں ہونے چاہئیں؟ اور کیا بیٹا ہوش منہانے کے بعد ماں کے ساتھ



وہ مصومانہ بے تکلفی برت سکتا ہے اور بیٹے کے درمیان اب ہوتی ہے ؟

اور کیا ایک گھر میں باپ اور بیٹے کے درمیان رقابت اور حسد کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں گے اگر ماں اور بیٹے کے درمیان ابدی حرمت کی دیوار حائل نہ ہو ؟

ایسا ہی معاملہ بہن اور بھائی کا بھی ہے ۔ اگر ابدی حرمت ان کے درمیان

قائم نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ بھائی بہن ایک دوسرے کے ساتھ مصغوم و وابط اور

شہوات سے پاک محبت اور شہادت سے بالاتر بے تکلفی برت سکتے ؟ کیا اس

صحت میں بھی یہ ممکن ہوتا کہ والدین اپنے بیٹوں کو سن مودغ کے قریب پہنچنے پر ایک

دوسرے سے دُور رکھنے کی کوشش نہ کرتے ؟ اور کیا کوئی شخص بھی کسی لڑکی

سے شادی کرتے وقت یہ اطمینان کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں سے بچی ہوئی ہوگی ؟

پھر اگر خسر اور بہو کے درمیان ، اور ساس اور داماد کے درمیان ابدی حرمت

کی دیواریں حائل نہ کردی جاتیں تو کس طرح ممکن تھا کہ باپ اور بیٹے اور ماں اور

بیٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ رقیبہ و تمکیش میں مبتلا ہونے اور ایک دوسرے

کو شہ کی نظر سے دیکھنے سے بچ جائیں ؟

اس پہلو پر اگر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ شریعت نے

کن اہم اخلاقی و معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر ان تمام مروجوں اور عود قیوں کو ایک

دوسرے کے لیے حرام کر دیا ہے جن کے درمیان ایک گھر ، ایک خاندان اور

ایک دائرۂ معاشرت کے اندر قریب ترین ذوالہلہ اور بے تکلف و وابط فطرتاً

ہو گئے ہیں اور معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ہونے چاہئیں ۔ بیٹے اور

بیٹیاں مل ہی نہیں سکتیں اگر ماں اور باپ دونوں اس طرف سے بالکل مطمئن نہ

ہوں کہ ان میں سے کسی کا بھی کوئی شہوانی علاقہ اپنی اولاد کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک ہی گھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کا پتہ غیر ممکن ہو جائے۔ اگر بہن کے معاملہ میں بھائیوں کے درمیان اور بھائی کے معاملہ میں بہنوں کے درمیان شہوانی رقابتیں پیدا ہونے کا اندازہ قطعاً طود پر بند نہ ہو۔ خالائیں اور چھو پھیاں اور چچا اور ماموں اگر شہدے ہلائے کہ وہ بچے جائیں تو بہن اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے اور بھائی اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے بچانے کی فکر میں لگ جائیں۔

(ترجمان القرآن، ذی القعدہ، ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ - ستمبر ۱۹۵۱ء)

## عورتوں میں ہم جنسیت

سوال :-

ان دنوں زمانہ کا لہجوں کی رسوم نفس میں لڑکیوں کے اندر عجیب و ہائیں پھیل رہی ہیں۔ بالعموم دو لڑکیوں کی دوستی خلوص اور محبت کی حدود سے گزر کر جنسی محبت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ شرفاً یہ کس درجے کا گناہ ہے؟ کیسے یا صغیرہ؟

جواب :-

مرد اور مرد کی جنسی محبت جتنا بڑا گناہ ہے، عورت اور عورت کی محبت بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ اخلاقی حیثیت سے ان دونوں میں نہ نوعیت کا فرق ہے اور نہ درجے کا۔ افسوس ہے کہ یہ نام نہاد "ارباب لطیف" جو رسالوں اور

افسانوں اور ناولوں کی شکل میں گھر گھر پہنچ رہا ہے، اور یہ فحش تصویریں اور فلم  
جنہیں آزادی کے ساتھ مردوں کی طرح حد تک بھی دیکھ رہی ہیں، اور یہ اختلاط  
مرد و زن جس کو روز بروز ہاری نسومانی میں فروغ نصیب ہو رہا ہے، ان  
ساری چیزوں نے مل جل کر نوجوان مردوں کی طرح نوجوان لڑکیوں کو بھی غیر معمولی  
جذباتی ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے۔ شہوانی جذبات کی ایک بھیڑ ہے جو سینوں میں بھڑکا  
دی گئی ہے اور بہت سی دھوکھیں ہر آن اسے زیادہ اور زیادہ بھڑکانے میں  
لگی ہوئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بگاڑ اب تک زیادہ تر مردوں میں پایا جاتا  
تھا، وہ ایک دبا کی طرح شریف گھروں کی لڑکیوں اور درسگاہوں کی طالبات اور  
اداسٹائیوں میں بھی پھیلنا شروع ہو گیا ہے۔ جن خواتین کو زمانہ درسگاہوں کے  
حالات قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے ان کی اطلاع یہ ہے کہ آج لڑکیوں  
میں جو بے حیائی، میاکی، جنسی مسائل پر کھلی کھلی گفتگو کرنے کی جرات اور جنسی  
رجحانات — فطری اور غیر فطری، ہر دو طرح کے رجحانات — کے اظہار  
و اعلان کی عام خسارت پائی جاتی ہے، چند سال پہلے تک اس کا تصور کرنا مشکل  
تھا۔ اب لڑکیوں میں یہ چرچے عام ہو رہے ہیں کہ کوئی صاحبزادی کس اُستانی کی  
متصور نظر ہیں، اور کوئی صاحبزادی کس دوسری صاحبزادی کے عشق میں مبتلا ہیں۔  
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ !

لطف یہ ہے کہ اس جہنم کی طرف جو لوگ اپنی قوم کو دھکیل رہے ہیں، وہ اپنی  
اب تک کی کوششوں کے نتائج سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ انہیں حسرت یہ ہے کہ  
کاش ملا کی خلعت و زراعت راہ میں حائل نہ ہوتی تو وہ ترقی کے مزید قدم ذرا جلدی

(ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۱۳۷۱ھ۔ جون، جولائی ۱۹۵۲ء)

## نیک چلنی کا انوکھا تصور

سوال ۱ :

میں نے ایک دو تیزہ کو لاپنج دیا کہ میں اُس سے شادی کر دوں گا۔ پھر اس کے ساتھ خلاف اخلاق تعلقات رکھے۔ میں نہایت دہانت داری سے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس لڑکی کے خاندان کا عام عدو میں زانیہ بدکار ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کی ماں بھی۔ اب مجھے خوف ہے کہ اگر میں اس لڑکی سے شادی کر لوں تو وہ بھی بدچلنی ثابت دہو۔ ترجمان القرآن کے مدیر سے مطلع کیجئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

جواب ۱ :

یہ ایک گنہام خط ہے جو ہمیں حال میں موصول ہوا ہے۔ عموماً گنہام خطوط جو آپ کے مستحق نہیں ہوا کرتے۔ لیکن اس کا جواب اس لیے دیا جا رہا ہے کہ ہماری بدقسمت سوسائٹی میں اس وقت بہت سے ایسے نوجوان موجود ہیں جن کے اندر سائل کی سی ذہنیت پائی جاتی ہے۔ خود بدکار ہیں مگر شادی کے لیے کوئی ایسی لڑکی چاہتے ہیں جو عقیفہ ہو۔ جس طرف کو انہوں نے خود گندہ کیا ہے اُسے دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے لیے کوئی ایسا طرف تلاش کرتے ہیں

جسے کسی نے گندہ نہ کیا ہو ۔

جناب سائل سے گزارش ہے کہ جس لڑکی کو آپ نے خود شادی سے پہلے خراب کیا ہے اس کے لیے اب آپ سے زیادہ موزوں کون ہو سکتا ہے ؟ اور وہ آپ سے زیادہ اندکس کے لیے موزوں ہو سکتی ہے ؟ آپ کو اپنے لیے نیک چلن لڑکی کیوں مدکار ہے جب کہ آپ خود بد چلن ہیں ؟ جب اس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنے جسم کو آپ کے حوالے کیا تھا کیا اسی وقت آپ کو یہ معلوم نہ ہو گیا تھا کہ وہ بد چلن ہے ؟ پھر آپ کو اب یہ اندیشہ کیوں لاحق ہوا کہ آگے چل کر وہ کہیں بد چلن ثابت نہ ہو ؟ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے ملوث ہونا تو نیک چلنی ہے اور بد چلنی صرف دوسروں سے ملوث ہونے کا نام ہے ؟ پھر اس کے خاندان کی عورتوں پر آپ کا اعتراض بھی عجیب ہے ۔ وہ خواتین کرام جیسی کچھ بھی ہیں ، اسی لیے ہیں کہ آپ جیسے معزز اصحاب سے ان کو سابقہ پیش آتا رہا ہے ۔ آپ اگر اس راہ پر بعد میں آئے ہیں تو آخر اپنے پیش روؤں کے انجام دیئے ہوئے کارناموں سے اس بد جہ نفرت کیوں ظاہر فرماتے ہیں ؟ بڑا نہ مانئے ، آپ واللہ یا ما واللہ ٹھیک اس خاندان میں پہنچ گئے ہیں جس کے لیے آپ موزوں تر ہیں اور جو آپ کے لیے موزوں تر ہے ۔ کسی دوسرے پاکیزہ خاندان کو خراب کرنے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ آپ اُسی خاندان میں پھیر جائیں جس کو آپ جیسے لوگ خراب کر چکے ہیں ، اور جسے خراب کرنے میں آپ کا حصہ بھی شامل ہے ۔

آخر میں محترم سائل کو قرآن کی دو آیتیں بھی سن لینی چاہئیں ۔ پہلی آیت یہ

ہے :

الزانی لا ینکم الا زانیۃ او مشرکۃ والزانیۃ لا  
 ینکحها الا زان او مشرک وحرم ذالک علی المؤمنین  
 ( النور - )

زانی مرد کا کاح نہیں کیا کرتا مگر ایک زانیہ یا مشرکہ عورت سے ، اور  
 زانیہ عورت سے نکاح نہیں کیا کرتا مگر ایک زانی اور مشرکہ اور ایسا کرتا  
 مومنین پر حرام ہے ۔

اس آیت میں ” نکاح نہیں کیا کرتا “ سے مطلب یہ ہے کہ زانی مرد اس  
 لائق نہیں ہے کہ اس کا کاح زانیہ یا مشرکہ کے سوا کسی اور سے ہو ۔ اور زانیہ  
 عورت کے لیے اگر کوئی شخص موزوں ہے تو زانی یا مشرکہ مرد ، نہ کہ کوئی مومن  
 صالح ۔

دوسری آیت یہ ہے :

الْمُحْشِشَاتُ لِلْمُحْشِشِينَ وَالْمُحْشِشُونَ لِلْمُحْشِشَاتِ ج وَ  
 الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۔

بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لیے ہیں اور بدکار مرد بدکار عورتوں کے  
 لیے ۔ اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ  
 عورتوں کے لیے ۔

ترجمان القرآن ۔ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ ۔ جنوری ۱۹۵۱ء

## نیکی بھی عیب ہے !

سوال :

مجھے آپ کی تحریک سے ذاتی طور پر نقصان پہنچ رہا ہے۔ میری ایک بہن آپ کی جماعت میں شامل ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جون بدل گئی ہے۔ ہر وقت نماز، قیام، وعظ اور نصیحت سے کام ہے۔ گھر کے افراد کو رہدستی آپ کا ترجمہ قرآن سناتی ہے۔ اگرچہ تعلیم یافتہ ہے لیکن خیالات کے اعتبار سے وہ موجودہ زمانہ کی لڑکی نہیں رہی۔ لباس مادہ اور سفید پہنتی ہے۔ جس دن دل چاہے روزہ رکھ لیتی ہے۔ میں اس کے اس طرز سے نہایت پریشان ہوں۔ رشتہ داروں میں جو سنتا ہے وہ اس لیے رشتہ پر آمادہ نہیں ہوتا کہ رات دن وعظ کون سنے۔ پرسوں میری خالہ آئی تھیں، ان کو بھی یہ نصیحت کر لے گئیں۔ چند کتابیں اور ایک کیلنڈر آپ کے ہاں کا انہیں دے ہی دیا۔ کل اتوار تھا۔ ہم لوگ سیر کے لیے گئے، اس سے بہت کہا مگر یہ نہیں گئی۔ بالکل دلیوں کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے اس ماحول میں آخر کس طرح گنجائش پیدا کی جائے۔ نہ تو اس کی شادی اس طرح ہو سکتی ہے اور نہ اس کے خیالات بدلنے میرے یا کسی کے بس میں ہے۔ اگر اس سے کچھ کہا سنا جائے تو رنجیدہ ہو جاتی ہے۔ بتائیے میں کیا کروں ؟

جواب :-

اس معاملے میں میں خود بھی سبے میں ہوں۔ آپ اپنے طرز پر ہی کوشش کریں کہ آپ کی ہمشیرہ اسلام سے توبہ کر لیں۔

(ترجمان القرآن - شعبان، رمضان ۱۳۴۲ھ - مئی، جون ۱۹۵۲ء)

---



# مستغرق مسائل

## بیمہ کا جواز و عدم جواز

سوال ۱۰

انشورنس کے مسئلے میں مجھے تردد ہے، اور صحیح الجہد پر سمجھ میں نہیں آسکا کہ آیا بیمہ کرنا اسلامی نقطہ نظر سے جائز ہے یا ناجائز؟ اگر بیمے کا موجودہ کاروبار ناجائز ہو تو پھر اسے جائز بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اگر موجودہ حالات میں ہم اسے ترک کر دیں تو اس کے نتیجے میں معاشرے کے افراد بہت سے فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ دنیا بھر میں یہ کاروبار جاری ہے، ہر قوم و ملیع پیانے پر انشورنس کی تنظیم کر چکی ہے اور اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے ہاں ابھی تک اس بارے میں تاہل اور تردد ب پایا جاتا ہے۔ آپ اگر اس معاملے میں صحیح صحت تک رہنمائی کریں تو سنوں ہوگی۔

جواب :-

انشورنس کے بارے میں شرع اسلامی کی دوسے تین اصولی اعتراضات ہیں جن کی بنا پر اسے جائز نہیں ٹھہرایا جاسکتا ۔

اول یہ کہ انشورنس کمپنیاں جو روپیہ ( Premium ) کی شکل میں وصول کرتی ہیں اس کے بہت بڑے حصے کو سودی کاموں میں لگا کر فائدہ حاصل کرتی ہیں اور اس ناجائز کاروبار میں وہ لوگ آپ سے آپ حق دار بن جاتے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اپنے آپ کو یا اپنی کسی چیز کو ان کے پاس انشور کراتے ہیں ۔

دوم یہ کہ موت یا حادثہ یا نقصان کی صورت میں جو رقم دینے کی ذمہ داری کمپنیاں اپنے ذمہ لیتی ہیں اس کے اندر قمار کا اصول پایا جاتا ہے ۔

سوم یہ کہ ایک آدمی کے مرنے کی صورت میں جو رقم ادا کی جاتی ہے ، اسلامی شریعت کی دوسے اس کی حیثیت مرلے والے کے ترکے کی ہے ۔

جسے شرعی وارثوں میں تقسیم ہونا چاہیے ۔ مگر یہ رقم ترکے کی حیثیت میں تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ اُس شخص یا ان اشخاص کو مل جاتی ہے جن کے لیے پالیسی ہولڈر نے

وصیت کی ہو ۔ حالانکہ وارث کے حق میں شرفا وصیت ہی نہیں کی جاسکتی ۔ رہا یہ سوال کہ انشورنس کے کاروبار کو اسلامی اصول پر کس طرح چلایا جاسکتا

ہے ، تو اس کا جواب اتنا آسان نہیں جتنا یہ سوال آسان ہے ۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ماہرین کی ایک مجلس جو اسلامی اصول کو بھی جانتی ہو اور انشورنس

کے معاملات کو بھی سمجھتی ہو ، اس پر دسے مکے کا بھانڈہ لے اور انشورنس کے

کاروبار میں ایسی اصلاحات تجویز کرے جن سے کاروبار بھی چل سکتا ہو اور شریعت کے اصولوں کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہیں کم از کم یہ تسلیم تو کرنا چاہیے کہ ہم ایک غلط کام کر رہے ہیں۔ غلطی کا احساس بھی اگر ہم میں باقی نہ رہے تو پھر اصلاح کی کوشش کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

بے شک موجودہ زمانے میں انشورنس کی بڑی اہمیت ہے، اور ساری دنیا میں اس کا چلن ہے۔ مگر نہ اس دلیل سے کوئی حرام چیز حلال ہو سکتی ہے اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب حلال ہے یا اسے اس بنا پر حلال ہونا چاہیے کہ دنیا میں اس کا چلن ہے۔ ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم جائز و ناجائز میں فرق کریں اور اپنے معاملات کو جائز طریقوں سے چلانے پر اصرار کریں۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۶۲ء)

## اسلامی حکومت میں خواتین کا دائرہ عمل

سوال ۱۔

کیا اس دور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی، معاشی و معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی جبکہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس نے تاریک ترین دور میں بھی عورت کو ایک مقام (Status) عطا کیا؟ کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے ورثہ کا حصہ لینے کا

حق دیا جاسکتا ہے؟ کیا ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں  
 غلط تعلیم یا مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے ملک و قوم کی اقتصادی  
 حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہوگی؟ فرض کیجئے اگر اسلامی حکومت  
 خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرتِ آراء سے  
 وزارت و صدارت کے عہدوں کے لیے الیکشن لڑ کر کامیاب  
 ہو جائیں تو موجودہ بیسویں صدی میں بھی کیا ان کو منصبِ اعلیٰ کا حق  
 اسلامی احکام کی رو سے نہیں مل سکتا جبکہ بہت سی شائیں آج موجود ہیں  
 شفا سیلون میں وزارتِ عظمیٰ ایک عورت کے پاس ہے یا نیدر لینڈ میں ایک  
 خاتون ہی حکمرانِ اعلیٰ ہے۔ برطانیہ پر حکمرانی کسٹھنشاہیت ہے سفارتی  
 حلقہ جیسے عابدہ سلطانہ دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہے اور اب  
 بیگم رضایا قتل علی خاں نیدر لینڈ میں سفیر ہیں۔ یا دیگر جس طرح سرزوبے  
 کشی پنڈت برطانیہ میں ہائی کمنر ہیں۔ اور اتوام متحدہ کی صدر رہ چکی ہیں۔  
 اور بھی شائیں جیسے نور جہاں جھانسی کی رانی رضیہ سلطانہ، حضرت محل زوجہ  
 واجد علی شاہ (Princess of Women) کہلاتی ہیں جنہوں  
 نے انگریزوں کے خلاف بھٹو میں جنگ لڑی، کمانڈر کی۔ اس طرح خواتین  
 نے خود کو پورا اہل ثابِت کر دیا ہے۔ تو کیا اگر آج محترمہ فاطمہ جناح  
 صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام  
 میں اس کی اجازت نہ دیں گے؟ کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر، وکلاء، فزیشن  
 جج، فوجی انفریا، پائلیٹ وغیرہ بننے کی مطلق اجازت نہ ہوگی؟ خواتین

کایہ بھی کارنامہ کردہ نرسوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں قابل ذکر ہے۔ خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے سرگرمی کی، پانی پیا اور حوصلے بند کیے۔ تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدمی قوم کو مکانات کی چار دیواری میں مقید رکھا جائے گا؟

جواب :-

اسلامی حکومت دین کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے، اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں۔ آخرت میں اپنے اجر کے لحاظ سے برابر ہیں۔ لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ یا تو ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو جائے گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر عورتوں پر دہرا بار ڈالاجائے گا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔ عطا یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لازماً پہلی صورت

ہی رونما ہو گی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آنکھیں  
بند کر کے دوسری کی حقائق کی نقل اتارنا عقل مندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت  
کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ کیونکہ اسلامی احکام کی رو سے خاندان کی پرورش  
کا سارا مالی بار مرد پر ڈالا گیا ہے۔ بیوی کا مہر اور نفقہ بھی اس پر واجب ہے  
اس کے مقابلے میں عورت پر کوئی مالی بار نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس صورت میں  
آخر عورت کو برابر کے برابر حصہ کیسے دلایا جاسکتا ہے۔

اسلام اصولاً مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان  
کے استحکام کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا کہ عورتوں اور مردوں کی  
مخلوط سوسائٹی ہو۔ مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر  
ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو جھگٹنے کے لیے تیار ہوں تو شوق سے جھگٹتے  
رہیں لیکن آخر کیا ضروری ہے کہ اسلام میں ان افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے  
جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرعہ بپ کا کام لیا گیا ہے تو  
اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں  
اور کلبوں اور پارٹینٹوں میں لاکھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرہ عمل میں اگر عورتیں  
کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتیں۔ اس لیے کہ وہ ان کاموں  
کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لیے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف  
کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کیے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور

پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے  
 بھی تو ان کا دہر نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا  
 نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے، نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور  
 اپنے اصل دائرہ عمل میں جس کے لیے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی  
 ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے اہل  
 کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدمی نہ نہ اندھی مردانہ خصوصیات  
 سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند  
 سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں  
 کارکنوں کی ضرورت ہے کیا وہاں تمام خواتین موزوں ہو سکیں گی؟ ابھی حال ہی  
 میں مہر کے سرکاری محکموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں  
 بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں  
 بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی بہ نسبت ۵۵  
 فیصد سے زیادہ نہیں۔ پھر مہر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ  
 عورتوں کے پاس پنچ کر کوئی راز راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے  
 جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورتوں کا دخل ہوتا  
 ہے۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلواری  
 جانی چاہیے، لیکن چند شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی  
 جائے جس سے وہ اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے لیے ٹھیک ٹھیک تیار

ہو سکیں اور ان کی تعلیم بعینہ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو۔ دوسرے یہ کہ تعلیم غلو طہ ہو اور عورتوں کو زمانہ تعلیم گاہوں میں عورتوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے۔ غلو طہ تعلیم کے مہلک نتائج مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آچکے ہیں کہ اب صرف عقل کے اندھے ہی ان کا انکار کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے امریکہ میں، اس سال تک ہر کی لڑکیاں جو ہائی سکولوں میں پڑھتی ہیں، غلو طہ تعلیم کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اوسطاً ایک ہزار حادثہ نکلتی ہیں گو ابھی یہ شکل ہمارے ہاں مدنا نہیں ہوئی ہے لیکن اس غلو طہ تعلیم کے نتائج سامنے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین۔ ایسے اداروں میں کام لیا جائے جو صرف عورتوں کے لیے ہی مخصوص ہوں مثلاً زمانہ تعلیم گاہیں اور زمانہ ہسپتال وغیرہ۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۶۲ء)

## بے حیائی کے مظاہر اور قانونِ اسلام

سوال ۱۔

کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی؟ جیسے ان کی ریڈائش اور نیم عریاں لباس زیب تن کرنے اور فیشن کا رجحان اور جیسے آج کل نو جوان لڑکیاں نہایت تنگ سنٹ سے معطر لباس اور غارہ و سرخی سے مزین اپنے ہر



خود خال اندر شیب و فراز کی نمائش برسر عام کرتی ہیں اور آج کل  
 نوجوان لڑکے بھی ہائی وڈ فلموں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائے بن رہے  
 ہیں۔ تو کیا حکومت قانون *Law* کے ذریعے سے  
 ہر مسلم و غیر مسلم لڑکے اور لڑکی کے آزاد رجحان کو روکے گی؟ خلاف  
 دہندی پر سزا دے گی والدین و سرپرستوں کو جرمانہ کیا جاسکے گا؟ تو  
 اس طرح کیا ان کی شہری آزادی پر ضرب نہ لگے گی؟ کیا گرلز گائیڈ  
 بوا (APWA) یا دیگر دالی، ایم، سی، اے (YMCA)  
 اور دالی، ڈبلیو، سی، اے (YWCA) جیسے ادارے اسلامی  
 نظام میں گوارہ کیے جاسکتے ہیں؟ کیا خواتین اسلامی عدلیہ سے خود  
 طلاق لینے کی مجاز ہو سکیں گی اور مردوں پر ایک سے زیادہ شادی  
 کی پابندی آج جائز ہوگی؟ یا خواہ اسلامی عدالت کے رد پر وہی  
 ان کو اپنی پسند سے (Civil Marriage) کرنے کا حق  
 حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا خواتین کو یوتھ فیئیل، کھیلوں، نمائش، ڈراموں  
 ناچ، فلموں یا مقابلہ حسن میں شرکت یا (Amusement)  
 وغیرہ بننے کی آج بھی اسلامی حکومت مخالفت کرے گی۔ ساتھ ہی قوی  
 کر دہ تباہ کرنے والے مشا سینا، خلیں، ٹیل و شیرن، ریڈیو پر فحش گانے  
 یا عربی رسائل و ٹریجر موسیقی، ناچ و رنگ کی ثقافتی ٹیلیں وغیرہ کو  
 بند کر دیا جائے گا یا فائرہ اٹھانا ممکن ہوگا؟

جواب ۱۔

اسلام معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا سارا کام نفع قانون کے ڈنڈے سے نہیں لیتا، تعلیم، نشر و اشاعت اور رائے عامہ کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ جائے تو اسلام قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ محدثوں کی عریانی اور بے حیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی سچی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری تدابیر اصلاح سے درست نہ ہو یا اس کا دھند باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو اندر دئے قانون رد کنہا پڑے گا۔ اس کا نام اگر شہری آزادی پر ضرب لگانا ہے تو جواریوں کو پھڑنا اور جیب کتروں کو سزائیں دینا بھی شہری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ اجتماعی زندگی لازماً افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے۔ انفرادی کو اس کے لیے آزاد نہیں چھوڑا جاسکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور دوسروں سے سیکھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرہ کو خراب کریں۔

گرلز گائیڈز (Girl Guides) کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔  
اپوا (APWA) قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال نہ کرنا چھوڑ دے۔  
(YMCA) عیسائی عورتوں کے لیے رہ سکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ مسلمان عورتیں اگر چاہیں تو  
(YWMA) بنا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلامی حدود میں رہیں۔

مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعے سے طلاق کر سکتی ہے۔ فیخ نکاح

(Nullification) اور تفریق (Judicial Separation)

کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری عدالت سے حاصل کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن طلاق (Divorce) کے اختیارات قرآن نے صریح الفاظ میں صرف مرد کو دیئے ہیں اور کوئی قانون مردوں کے اس اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہ بات ہے کہ قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں۔ پوری اسلامی تاریخ عہد رسالتؐ سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے نا آشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مرد سے سلب کر لیا جائے اور کوئی عدالت یا انجمن اس میں دخل دے۔ یہ تخیل سیدھا یورپ سے چل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے کبھی اسکھین کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانون طلاق کا پس منظر (Background) کیا ہے اور وہاں اس کے کتنے بُرے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکینڈل نکل کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو تپہ چلے گا کہ خدا کے قوانین میں ترمیم کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں از روئے قانون پابندی عائد کرنے یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تخیل بھی ایک بیرونی مال ہے جسے قرآن کے جعلی پرست پر درآمد کیا گیا ہے۔ یہ اُس سوسائٹی میں سے آیا ہے

جس میں ایک ہی عورت اگر منگوا کر بیوی کی موجودگی میں داشتہ کے طور پر رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابل برداشت ہے بلکہ اس کے حرامی بچوں کے حقوق محفوظ کرنے کی بھی فکر کی جاتی ہے (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے) ، لیکن اگر اسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے۔ گویا ساری پابندیاں حلال کے لیے ہیں، حرام کے لیے نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ایک جگہ سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار (Values) اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانوناً جائزہ اند نکاح قانوناً حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ مسلمانوں میں زنا کا رواج بڑھے گا۔ اگر ل غریبہ اور داگشتائیں (Mistresses) فروغ پائیں گی اور دوسری بیوی ناپید ہو جائے گی۔ یہ ایک ایسی سوسائٹی ہو گی جو اپنے خدوخال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دُور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہو گی۔ اس صورت حال کے تصور سے جس کا جی چاہے مطمئن ہو۔ مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میریج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو کسی شرک عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں یا کسی ایسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لیے تیار نہ ہو اور مسلمان مرد اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہو گا۔

یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہے تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟  
 اور اسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اس کی اجازت دے؟ اور ایک اسلامی  
 عدالت کا یہ کام کب ہے کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کر دے۔

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یوتھ فیسٹیول (Youth Festival)  
 اور کھیلوں کی نمائشوں اور ڈراموں اور رقص و سرور اور مقابلہ حسن میں مسلمان  
 عورتوں کو بلائے یا ایئر ہوسٹس (Air Hostesses) بنا کر مسافروں کے  
 دل موہنے کی خدمت ان سے لے تو ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلامی  
 حکومت کی آخر ضرورت کیا ہے۔ یہ سارے کام تو کفر اور کفار کی حکومت  
 میں آسانی ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

سینا، فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں بگاڑ  
 خود کوئی خرابی نہیں۔ خرابی ان کے استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے  
 والا ہے۔ اسلامی حکومت کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی  
 فلاح کے لیے استعمال کرے اور اخلاقی فساد کے لیے استعمال ہونے کا  
 دروازہ بند کر دے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۷ - عدد ۴ - جنوری ۱۹۷۲ء)

## فتنہ تصویر

سوال ۱۔

آج کل تصویروں اور فوٹو گرافی کا استعمال کثرت سے ہے۔ زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ان کا استعمال ایک تہذیبی معیار بن گیا ہے۔ بازار کی دکانوں میں، مکانوں کے ڈرائنگ روموں میں، رسالوں کے سر صفحہ پر، اخباروں کے کالموں میں، غرضیکہ جس طرف بھی نگاہ اٹھتی ہے اس لعنت سے سائلہ شہرتا ہے اور بعض اوقات توجہ مبذول ہو سکے رہتی ہے۔ کیا نسوانی تصویروں کو بھی پوری توجہ کے ساتھ دیکھنا غناہ ہے۔

جواب ۱۔

تصویروں کا فتنہ فی الواقع ایک بلائے عام بلکہ سیلابِ بھ کی صورت اختیار کر گیا ہے جس کا کوئی علاج میرے علم میں اس کے سوا نہیں ہے کہ بحیثیت مجموعی نظامِ زندگی میں تغیر واقع ہو اور اس نظام کی زمام کار ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو معاشرے میں تمام منکرات کے خاتمہ کو روک دیں۔ جب تک یہ سیلاب اشد رہا ہے، جو شخص جس حد تک بھی اس سے بچ سکتا ہو بچنے کی کوشش کرے۔ نسوانی تصویروں کے ساتھ بھی وہی فیصلہ برکامعاطہ کرنا چاہیئے جو خود عورتوں کے لیے شریعت نے لازم کیا ہے، کیونکہ جیتی جاگتی عورت کو گھورنے اور اس کی تصویر کو دیکھنے کے اثرات و نتائج قریب قریب یکساں

بین (ترجمان القرآن جلد ۵۲، عدد ۵ - اگست ۱۹۵۹ء)

## رشوت اور اضطرار

سوال :-

(۱) حالتِ اضطرار کیا ہے؟ کیا اضطرار کے بھی حالات اور ماحول کے لحاظ سے مختلف درجات ہیں؟

(۲) موجودہ حالات اور موجودہ ماحول میں کیا مسلمانوں کے لیے کسی صورت میں بھی رشوت جائز ہو سکتی ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے رشوت کی ایک جامع تعریف بھی بیان کر دیجئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس قسم کے معاملات رشوت کی تعریف میں آتے ہیں۔

جواب :-

اضطرار یہ ہے کہ آدمی کو شریعت کی مقرر کی ہوئی حدود سے کسی حد پر قائم رہنے میں ناقابلِ برداشت نقصان یا تکلیف لاحق ہو۔ اس معاملہ میں آدمی اور آدمی کی قوتِ برداشت کے درمیان بھی فرق ہے اور حالات اور کے لحاظ سے بھی بہت کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کون شخص کس وقت کن حالات میں مضطر ہے، خود اُس شخص کا کام ہے

جو اس حالت میں مبتلا ہو اُسے خود ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور آخرت کی جوابدہی کا احساس کرتے ہوئے یہ رائے قائم کرنی چاہیئے کہ آیا وہ واقعی اس درجہ مجبور ہو گیا ہے کہ خدا کی کوئی حد توڑ دے؟

موجودہ حالات ہوں یا کسی اور قسم کے حالات، رشوت لینا تو ہر حال حرام ہے۔ البتہ رشوت دینا صرف اس صورت میں ہر بنائے اضطراب جائز ہو سکتا ہے جبکہ کسی شخص کو کسی ظالم سے اپنا جائزہ حق حاصل نہ ہو رہا ہو اور اس حق کو چھوڑ دینا اس کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچاتا ہو اور اوپر کوئی اختیار حاکم بھی ایسا نہ ہو جس سے شکایت کر کے اپنا حق وصول کرنا ممکن ہو۔

رشوت کی تعریف یہ ہے کہ ”جو شخص کسی خدمت کا معاوضہ پاتا ہو وہ اسی خدمت کے سلسلے میں اُن لوگوں سے کسی نوعیت کا فائدہ حاصل کرے جن کے لیے یا جن کے ساتھ اس خدمت کے سلسلے میں اُن لوگوں معاملات انجام دینے کے لیے وہ مامور ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ لوگ برضا و رغبت اسے وہ فائدہ پہنچائیں یا مجبوراً“ جو عہدہ دار یا سرکاری ملازمین تحفے تحائف کو اس تعریف سے خارج ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر وہ تحفہ ناجائز ہے جو کسی شخص کو ہرگز نہ ملتا اگر وہ اس منصب پر نہ ہوتا۔ البتہ جو تحفے آدمی کو خالص شخصی روابط کی بنا پر ملیں، خواہ وہ اس منصب پر ہوں یا نہ ہوں، وہ بلاشبہ جائز ہیں۔

(ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۱۳۷۱ھ - جولائی ۱۹۵۲ء)



## اسلام اور سینما ٹوگرانی

سوال ۱۔

میں ایک طالب علم ہوں۔ میں نے جماعت اسلامی کے ٹریجر کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ خدا کے فضل سے مجھ میں نمایاں ذہنی و عملی انقلاب رونما ہوا ہے۔ مجھے ایک زمانے سے سینما ٹوگرانی سے گہری فنی دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں کافی معومات فراہم کی ہیں۔ نظریات کی تبدیلی کے بعد میری دلی خواہش ہے کہ اگر شرعاً ممکن ہو تو اس فن سے دینی و اخلاقی خدمت لیا جائے، آپ براہ کرم فرمائیے کہ اس فن سے استفادے کی گنجائش اسلام میں ہے یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر بھی واضح فرمائیں کہ عورت کا کردار پردہ و غم پر دکھانے کی بھی کوئی جائز صورت ممکن ہے یا نہیں؟

جواب ۱۔

میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ سینما بجائے خود جائز ہے، البتہ اس کا ناجائز استعمال اس کو ناجائز کر دیتا ہے۔ سینما کے پردے پر جو تصویر نظر آتی ہے وہ دراصل "تصویر" نہیں بلکہ پرچھائیں ہے، جس طرح آئینے میں نظر آیا کرتی ہے، اس لیے وہ حرام نہیں رہا۔ وہ عکس جو فلم کے اندر ہوتا ہے، تو وہ جب تک کاغذ یا کسی دوسری چیز پر چھاپ نہ لیا جائے، نہ اس پر تصویر کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ وہ ان کاموں میں سے کسی کام کے لیے

استعمال کیا جاسکتا ہے جن سے باز رہنے کی خاطر شریعت میں تصویر کو حرام کیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے میرے نزدیک سینما تجارتی خود مباح ہے۔

جہاں تک اس فن کو سیکھنے کا تعلق ہے، کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو اس سے منع کیا جائے۔ آپ کا اس طرف میلان ہے تو آپ اسے سیکھ سکتے ہیں بلکہ اگر مفید کاموں میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ ہو تو آپ اسے ضرور سیکھیں کیونکہ یہ قدرت کی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت ہے، اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے بھی دوسری فطری طاقتوں کے ساتھ خدمت حق اور مقاصد خیر کے لیے استعمال کیا جائے۔ خدا نے جو چیز بھی دنیا میں پیدا کی ہے، انسان کی بھلائی کے لیے اور حق کی خدمت کے لیے پیدا کی ہے۔ یہ ایک بد قسمتی ہوگی کہ شیطان کے بندے تو اسے شیطانی کاموں کے لیے خوب خوب استعمال کریں اور خدا کے بندے اسے خیر کے کاموں میں استعمال کرنے سے پرہیز کرتے رہیں۔

اب رہا فلم کو اسلامی اغراض اور مفید مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سوال، تو اس میں شک نہیں کہ بغاہر ایسے معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی، اور تاریخی فلم بنانے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی جو فواحش اور جنسی ہستیات، اور تعلیم جبرئیل سے پاک ہوں، اور جن کا اصل مقصد بھلائی کی تعلیم دینا ہو۔ لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں دو ٹوٹی باتیں ہیں جن کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔

اول یہ کہ کوئی ایسا معاشرتی فلم بنانا سخت مشکل ہے جس میں عورت کا سرے

سے کوئی پارٹ نہ ہو۔ اب اگر عودت کا پارٹ رکھا جائے تو اس کی دوسری صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں عودت ہی ایکٹر ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں مور کو عودت کا پارٹ دیا جائے۔ شرعاً ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے۔

دوم یہ کہ کوئی معاشرتی ڈرامہ بہر حال ایکٹنگ کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اور ایکٹنگ میں ایک عظیم الشان اخلاقی خرابی یہ ہے کہ ایکٹر آٹے دن مختلف سیرتوں اور کرداروں کا سوانگ بھرتے بھرتے بلا فریاد انفرادی کیرکٹر بالکل نہیں توڑی حد تک کھو بیٹھتا ہے۔ اس طرح چاہے ہم غمی ڈراموں کو معاشرے کی اصلاح اور اسلامی حقائق کی تعلیم و تبلیغ ہی کے لیے کیوں نہ استعمال کریں، ہمیں بہر حال چند انسانوں کو اس بات کے لیے تیار کرنا پڑے گا کہ وہ ایکٹر بن کر اپنا انفرادی کیرکٹر کھو دیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں اپنی شخصیت کی قربانی دیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ معاشرے کی بھلائی کے لیے، یا کسی دوسرے مقصد کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی پاکیزہ اور بلند مقصد ہو، کسی انسان سے شخصیت کی قربانی کا مطالبہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ جان، مال، عیش، آرام، ہر چیز تو قربان کی جاسکتی ہے اور مقاصدِ عالیہ کے لیے کی جانی چاہیے، مگر یہ وہ قربانی ہے جس کا مطالبہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بھی نہیں کیا ہے، کجا کہ کسی اور کے لیے اس کا مطالبہ کیا جاسکے۔

ان وجوہ سے میرے نزدیک سینا کی طاقت کو ڈراموں کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طاقت اور کس کام میں لائی جاسکتی ہے؟

میرا جواب یہ ہے کہ ڈرائے کے سوا دوسری بہت سی چیزیں بھی ہیں جو فلم میں دکھائی جاسکتی ہیں، اور ڈرائے کی نسبت بہت زیادہ مفید ہیں۔ مثلاً، ہم جغرافیائی فلموں کے ذریعہ سے اپنے عوام کو زمین اور اس کے مختلف حصوں کے حالات سے آگاہی وسیع واقفیت ہم پہنچا سکتے ہیں کہ گویا وہ دنیا بھر کی سیاحت کر آئے ہیں۔ اسی طرح ہم مختلف قوموں اور ملکوں کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو دکھا سکتے ہیں جن سے ان کو بہت سے سبق بھی حاصل ہوں گے اور ان کا نقطہ نظر بھی وسیع ہوگا۔

ہم علم ہیئت کے حیرت انگیز حقائق اور مشاہدات ایسے دلچسپ طریقوں سے پیش کر سکتے ہیں کہ لوگ شہوانی فلموں کی دلچسپیاں بھول جائیں، اور پھر یہ فلم اتنے سبق آموز بھی ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر توحید اور اللہ کی ہیبت کا سکہ بیٹھ جائے۔

ہم سائنس کے مختلف شعبوں کو سینما کے پردے پر اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ عوام کو ان سے دلچسپی بھی ہو، اور ان کی سائنٹفک معلومات بھی ہمارے اندر گتہ بخوشیوں کے معیار تک بلند ہو جائیں۔

ہم صفائی اور حفظانِ صحت اور شہریت (Civic) کی تعلیم بڑے دلچسپ انداز سے لوگوں کو دے سکتے ہیں جس سے ہمارے دیہاتی اور شہری عوام کی مفید معلومات ہی وسیع نہ ہوں گی بلکہ وہ دنیا میں انسانوں کی طرح جینے کا سبق بھی حاصل کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے مفید نمونے بھی لوگوں کو دکھا سکتے ہیں تاکہ وہ ان کے مطابق اپنے گھروں اور اپنی بستیوں اور

اپنے اجتماعی زندگی کو درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

ہم مختلف صنعتوں کے ڈھنگ، مختلف کار خالوں کے کام، مختلف اشیاء کے بننے کی کیفیت، اور زراعت کے ترقی یافتہ طریقے دنیا کے ہر دے پر دکھا سکتے ہیں جن سے ہماری صنعت پیشہ اور زراعت پیشہ آبادی کے معیارِ علم اور معیارِ کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہم دنیا کے تعلیم بالخل کا کام بھی لے سکتے ہیں اور اس کام کو اتحادِ پچپ بنایا جاسکتا ہے کہ ان پڑھ عوام اس سے ذرا نہ اکتائیں۔

ہم اپنے عوام کو فنِ جنگ کی، بول ڈیفنس کی، گوریل وار فیر کی، عیوں اور کوچوں میں دفاعی جنگ لڑنے کی، اور ہوائی حملوں سے تحفظ کی ایسی تعلیم دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے بہترین طریقے پر تیار ہو سکیں نیز ہوائی اور تہری اور بحری لڑائیوں کے حقیقی نقشے بھی ان کو دکھا سکتے ہیں تاکہ وہ جنگ کے عملی حالات سے پیشگی باخبر ہو جائیں۔

یہ، اور ایسے ہی بہت سے دوسرے مفید استعمالات دنیا کے ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی تجویز بھی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ ابتداً حکومت کی طاقت اور اس کے ذرائع اس کی پشت پر نہ ہوں۔ اس کے لیے اولین ضرورت یہ ہے کہ عشقِ بازی اور جرائم کی تعلیم دینے والے فلم ایک نکتہ بند کر دیئے جائیں کیونکہ جب تک اس شراب کی لت زبردستی لوگوں سے چھڑائی نہ جائے گی، کوئی مفید چیز ان کے منہ کو گھنی مال ہے۔ دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ ابتداً ہی مفید تعلیمی فلم حکومت کو خود اپنے سر لے

سے تیار کرانے ہوں گے اور ان کو عوام میں مدراج دینے کی کوشش کرنی ہوگی، یہاں تک کہ جب کاروباری حیثیت سے، فلم کامیاب ہونے لگیں گے تب نجی سرمایہ اس صنعت کی طرف متوجہ ہوگا۔  
(ترجمان القرآن - ذی القعدہ ۱۳۷۰ھ - مطابق اگست ۱۹۵۲ء)

## دعا میں بزرگوں کی حرمت و جاہ سے توسل

سوال ۱۔

میں نے ایک مرتبہ دریافت کیا تھا کہ مجاہد فلاں یا بحرہ فلاں کہہ کر خدا سے دعا کرنے کا کوئی شرعی ثبوت ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا تھا کہ اگرچہ اہل تصوف کے ہاں یہ ایک عام معمول ہے لیکن قرآن و حدیث میں اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکتی۔ میں اس سلسلے میں ایک آیت قرآنی اور ایک حدیث پیش کرتا ہوں صحیحہ بقرہ میں اہل کتاب کے بارے میں آیا ہے وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کھدوا۔ یعنی بعثت محمدی سے پہلے یہودی کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس کی تفسیر میں امام راغب نے مفردات میں فرمایا ہے ای یستعینون اللہ ببعثہ محمد (یعنی بعثت محمدی کے ذریعے اللہ سے مدد مانگتے تھے) وقیل کانوا یقولون انا لنتعو بمحمد

علیہ السلام علی عبدۃ الاوثان (اللہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہودیوں کہتے تھے کہ ہم کو بت پرستوں کے مقابلے میں محمد علیہ السلام کے ذریعہ سے نصرت بخشی جائے گی) وقیل یطلبون من اللہ بذکرہ النضر (اللہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے ذریعہ اللہ سے فتح مانگتے تھے)۔

ترمذی شریف کے البواب الدعوات میں ایک حسن صحیح غریب حدیث مروی ہے کہ ایک نابینا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اللہ عرض کیا کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ میری تکلیف کو دور کر دے۔ آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں دعا کروں اللہ اگر صبر کر سکتے ہو تو صبر کرو۔ صبر تمہارے لیے بہتر ہے۔ اُس نے عرض کیا آپ دعا فرمائیں۔ آپ نے اُسے اچھی طرح وضو کرنے کا حکم دیا اور یہ دعا پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ اللھم انی اسئلك والوجه الیک بنہیک محمد نبی الرحمة۔ انی توجعت بک انی دینی فی حاجتی هذا لنقض لی۔ اللھم انقضہ فی۔ (خدا یا میں تیرے نبی محمدؐ نبی کے ذریعہ سے تجھ سے دعا کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں۔ میں نے اپنی اس حاجت کے لیے اسے پروردگار تیری طرف توجہ کی ہے تاکہ تجھ میری حاجت پوری کر دے۔ پس اے اللہ! میرے حق میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت قبول فرما)۔

کیا اس آیت اور اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ دعا  
 میں بکرمست سید المرسلینؐ یا بجا و نبیؐ، بطفیل نبیؐ یا ببرکت حضورؐ کہنا  
 صحیح اور جائز ہے ؟  
 جواب :-

آیت مذکورہ کا یہ مطلب میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہودی آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل آپ کے تو تسل سے کفار کے مقابلے  
 میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب وہ ہے جو اہل راہب  
 کے پہلے رد احوال سے بھی نکلتا ہے اور جس کی تائید معتبر روایات سے بھی  
 ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے یہودی ان پیشین گوئیوں  
 کی بنا پر جو آپ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں، یہ دعائیں مانگا کرتے  
 تھے کہ وہ نبی آئے اور پھر اس کی بدولت ہمیں کفار پر غلبہ حاصل ہو جائیگا  
 ابن ہشام کی روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں حج کے موقع پر حبیب پہلی مرتبہ مدینہ  
 کے چند لوگوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طہات ہوئی اور آپ نے ان کے سامنے  
 اسلام پیش کیا تو وہ آپس میں کہنے لگے یا قوم تعلموا والله انہ لن نبی الذی  
 توعدکم بہ الیہود فلا تسبقنکم (ج ۲ ص ۲۷) ”لوگو! جان لو کہ  
 بخدا یہ وہی نبی ہے جس کی آمد کا خوف تم کو یہودی دلایا کرتے تھے۔ پس  
 ایسا نہ ہونے پائے کہ تم سے پہلے وہ اس کے پاس پہنچ جائیں۔“ پھر آگے  
 چل کر ابن ہشام اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے انصاری مدنیہ کے بڑے  
 مجتہدوں کا یہ قول نقل کرتے ہیں :



فينا والله وفيهم نزلت هذه القصه . كنا قد علونا هم  
 طهرا في الجاهلية ونحن اهل الشرك وهم اهل كتاب . فكانوا  
 يقولون لنا ان نبيا يبعث الآن فبعه قد اخل زمانه . فقتلكم  
 معه قتل عاد وادم . فلما بعث الله رسوله صلى الله عليه وسلم  
 من قریش فاتبعناه وكفروا به .

یعنی ” یہ آیت ہمارے اور یہودیوں کے بارے میں یہی نازل ہوئی ہے ۔  
 جاہلیت میں ہم ان پر غالب ہو گئے تھے اور ہم اہل شرک تھے اور وہ اہل  
 کتاب ۔ پس ہم سے وہ کہا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے  
 والا ہے جس کی آمد کا وقت آپنا ہے ۔ ہم اس کی قیادت میں ان کا اس طرح ماریا  
 گئے جیسے عاد و ارم مارے گئے ۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم کو قریش سے مبعوث کیا تو ہم نے آپ کی پیروی اختیار کر لی اور انہوں  
 نے آپ کا انکار کر دیا ۔“

رہی جامع ترمذی کی وہ حدیث جو آپ نے نقل فرمائی ہے تو اس کا مضمون  
 تو آپ ہی بتا رہے ہیں کہ ابستہ عابی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی کہ آپ دعا فرمائیں  
 اور آپ نے ہدایت فرمائی کہ اچھا تو اللہ سے دعا کر کہ ”خدا یا میں تیرے نبی“  
 کے واسطے سے تیرے حضور اپنی حاجت لے کر آیا ہوں ۔ تو میرے حق میں  
 اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سفارش قبول کر ۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ  
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کے حق میں دعا فرمائی اور اس سے بھی فرمایا  
 کہ میرے واسطے سے تو بھی اپنی حاجت طلب کر اور میری سفارش قبول کیے

جانے کی بھی دعا مانگ . یہ تو دعائی بالکل ایک فطری صورت ہے . اس کی مثال بالکل اتنی ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص مجھ سے کہے کہ فلاں حاکم کے پاس چل کر میری سفارش کر د ادد میں سفارش کرنے کے ساتھ ساتھ اُس شخص سے بھی کہوں کہ تو خود بھی حاکم سے عرض کر کہ میں انہیں سفارشی بنا کر لایا ہوں ، آپ ان کی سفارش قبول کر کے میری حاجت پوری کر دیں . یہ معاملہ ادد ہے . اس کے برعکس یہ ایک بالکل دوسرا طریق معاملہ ہے کہ کوئی شخص مجھ سے اجازت لیے بغیر خود ہی حاکم کے پاس پہنچ جائے ادد اپنی جو حاجت بھی چاہے میرا واسطہ دے کر پیش کر دے . اس دوسری صورت کو آخر پہلی صورت پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے ؟ دلیل پہلی صورت کی پیش کرنا اور اس سے جواز دوسری صورت کا نکالنا درست نہیں . دوسری صورت کا جواز ثابت کرنے کے لیے تو حضورؐ کا کوئی ایسا قول ملنا چاہیے جس میں آپؐ نے اپنے تمام لیواؤں کو عام اجازت مرحمت فرمائی ہو کہ جس کا جی چاہے اپنی ہر حاجت میرا واسطہ دے کر اللہ سے طلب کر لے .

(ترجمان القرآن . جہاد سی الادی ۳۴۲ ح . فروری ۱۹۵۲ء)

## نذر و نیاز اور ایصالِ ثواب

سوال ۱۔

براؤ کو کم مندرجہ ذیل دو سوالات کے جوابات عنایت فرمائیں :

(۱) نذر، نیاز اور فاتحہ کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

(ج) کیا ایک دکاندار کو ایسے شخص کے ہاتھ نہیں اپنا مال فروخت کر سکتا

ہے جس کے بارے میں اُسے یقین ہو کہ اس کا نذر لغو معاش کلچر جمعیت

ناخشہ کی تعریف میں آتا ہے ؟

جواب ۱۔

(۱) نیاز جو خالصتہ اللہ تعالیٰ کے لیے کی جائے ، بالکل جائزہ اور موجب

اجر و ثواب ہے ۔ اور اگر کوئی اتفاق فی سبیل اللہ کھانے یا کپڑے یا عطیے کی

صورت میں اس غرض کے لیے کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر ہمارے

کسی متوفی عزیز کی مغفرت فرمادے یا اس اتفاق کا ثواب اُس عزیز کو بخش دے

یہ بجائے خود اس فعل کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا ۔ رہا اس کا عزیز کے لیے نافع ہونا تو

اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے ، وہ چاہے تو اس کے لیے نافع بنا دے ورنہ

وہ اتفاق کرنے والے کے لیے تو بہر حال نافع ہوگا ہی ۔ اگر تلامذہ قرآن یا

دینی بدنی عبادت کر کے آدمی یہ دعا کرے کہ اس کا ثواب اُس کے کسی متوفی

عزیز کو پہنچ جائے تو اس میں اختلاف ہے کہ آیا ایصالِ ثواب کی یہ شکل بھی درست

ہے یا نہیں ۔ بعض ائمہ کے نزدیک یہ درست ہے اور بعض کے نزدیک درست

نہیں ہے۔ میں متعدد شرعی دلائل کی بنیاد پر مؤخر الذکر مسلک ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اگر کوئی مال یا بدنی عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے کی جائے اور ہندو گاہن دین میں سے کسی کو اس غرض کے لیے اس کا ثواب ایصال کیا جائے کہ وہ بزرگ اس ہدیے سے خوش ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہدیہ بھیجنے والے کے سفارشی بن جائیں تو یہ ایک ایسا مشتبہ فعل ہے جس میں جواز و عدم جواز یکہ گناہ اور فتنے تک کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہو جاتی ہے اور میں کسی پرہیزگار آدمی کو یہ مشورہ نہ دے گا کہ وہ اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالے۔

رہے وہ کھانے جو مریخی کسی بزرگ کے نام پر پکائے جاتے ہیں اور جن کے متعلق الفاظ مرتب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں بزرگ کی نیاز ہے، اور جن کے متعلق پکانے والے کی نیت بھی یہی ہوتی ہے کہ یہ ایک نذرانہ ہے جو کسی بزرگ کی روح کو بھیجا جا رہا ہے، اور جن سے متعلق ہمارے ہاں طرح طرح کے آداب مقرر ہیں اور بے حرمتی کی مختلف شکلیں ممنوع قرار پائی ہیں اور ان نیانوں کی برکات اور فوائد کے متعلق گہرے عقائد پائے جاتے ہیں تو مجھے ان کے حرام اور گناہ ہونے بلکہ عقیدہ توحید کے خلاف ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

(ب) اگر حرام ذریعہ معاش رکھنے والا شخص کسی دکاندار سے کوئی چیز خریدنا چاہے تو دکاندار کے لیے اس کے بیچنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ دکاندار کے پاس جس راستے سے قیمت پہنچے گی وہ حلال ہے۔ گندگی اور حرمت پیسے میں نہیں بلکہ کسب معاش کے طریقے میں ہے جس شخص کے پاس حرام

ذریعہ سے پیسہ آیا ہے، وہ اسی کے لیے حرام ہے۔ دوسرے شخص کو دیا پیسہ  
 اگر حلال راستے سے پہنچے تو اس کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔  
 (ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۱۴۴۱ھ۔ اگست ۱۹۵۲ء)

## نماز کی قصر و قضا

افسوس ہے کہ عرب ممالک کے نوجوان نہ تو خود دین کا کافی علم رکھتے ہیں اور نہ وہ  
 فقہائے مجتہدین میں سے کسی کا اتباع ہی کرتے ہیں اسی وجہ سے آئے دن ان کے  
 عجیب عجیب اجتہادات سننے میں آتے رہتے ہیں۔ مسافر کے معاملہ میں امام شافعیؒ  
 امام احمدؒ اور ایک روایت کی رو سے امام مالکؒ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جو شخص  
 کسی مقام پر چار دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے پوری نماز پڑھنی  
 چاہیئے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کا مسلک ہے کہ دس دن یا اس سے  
 زیادہ ٹھہرنے کی نیت مسافر کو مقیم بنا دیتی ہے۔ امام اذہبیؒ ہمارے دن کی امام ابوحنیفہؒ  
 پندرہ دن کی حد مقرر کرتے ہیں۔ علماء اسلام میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے  
 کہ اپنے شہر سے باہر نکل کر کسی دوسرے مقام پر کوئی شخص چاہے مہینوں اور برسوں  
 رہے مگر وہ مسافر ہی رہے گا اور قصر کرتا رہے گا۔ البتہ فقہاء ضررہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی  
 آدمی کسی مقام پر اس طرح رکا ہوا ہو کہ ہر وقت اس کے کوچ کر جانے کا امکان ہو  
 اور ٹھہرنے کی نیت نہ ہو، تو خواہ وہاں اسے مہینوں کا رکا ہوا ٹھہرے، وہ قصر کر سکتا  
 ہے۔ انہی دُجوحہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہ میں پندرہ دن اور پنج مکہ کے

موقع پر کمر میں اٹھارہ دن قصر فرمایا (مسند احمد والہذاؤر) اللہ انہی وجوہ سے صحابہ کرام کا لشکر آندیکان کی مہم میں مدد بھیجے قصر کرتا رہا۔ (مسند احمد)

یہ بات بھی سخت حیرت انگیز ہے کہ یہ لوگ نماز کی قضا کے قائل نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ چیز بکثرت احادیث سے ثابت ہے اور تمام فقہائے اسلام بالاتفاق اس کے قائل ہیں۔ پھر یہی اسلامی تدبیر میں کوئی ایک قابل ذکر فقیہ بھی اس کا قائل نہیں ہوا ہے کہ مفسر کے قضا تو واجب ہے مگر نماز کی قضا واجب نہیں۔ بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، مسند احمد میں متعدد احادیث حضرت انس رضی اللہ عنہ، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں جن میں بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نماز کو انسان بھول جائے یا سوتا رہ جائے اور نماز کا وقت نکل گیا ہو، تو جس وقت بھی اسے یاد آئے یا وہ بیدار ہو اسے وہ چھوٹی ہوئی نماز پڑھ لینی چاہیے۔

یہ تو ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قولی حکم۔ رہا آپ کا اپنا فعل، تو ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، متعدد واقعات مسند احمد، بخاری، مسلم، انسائی میں منقول ہیں جن میں وہ بتاتے ہیں کہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ صابہ نے چھوٹی ہوئی نمازیں ادا کی ہیں۔

ایک سفر میں رات بھر چل کر آخر وقت میں قافلے نے پڑاؤ کیا اور اترتے ہی سب پر فینڈ غالب ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا تو اس کی گرمی سے لوگ بیدار ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اذان دلوائی اور جماعت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔ غزوہ خندق میں ایک روز عصر کی نماز قضا ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے وقت ادا کی۔ اور ایک اور دن اسی غزوہ میں ظہر، عصر اور

مغرب کی نمازیں قضا ہوئیں اور ایسے وقت یہ تینوں نمازیں ادا کی گئیں جب کہ عشاء  
کا وقت شروع ہو رہا تھا۔ اس کے بعد یہ کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ چونکہ  
پھوٹ گئی وہ معاف ہے ؟

( ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۲ء )

---